www.urduchannel.in

مطالعے کا سفر

اردو چینل
www.urduchannel.in

سلیم انصاری

www.urduchannel.in

مطالعے کا سفر

سلیم انصاری

تقسیم کار
حالی پبلشنگ ہاؤس، لکشمی نگر، دہلی

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

MUTAALEY KA SAFAR
by
SALEEM ANSARI

ansarisaleem320@gmail.com

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے‘‘۔

کتاب کا نام	:	مطالعے کا سفر
مصنف وناشر	:	سلیم انصاری
پتہ	:	ایچ آئی جی 3 آنند نگر/ادھارتال، جبل پور ایم پی 482004
موبائل نمبر	:	07070135643/ 07354308999
صفحات	:	214
قیمت	:	مبلغ -/137 روپے
تعداد اشاعت	:	500
سن اشاعت	:	2019ء
سرورق	:	حشمت اللہ عادل
کمپوزنگ	:	صبیحہ اطہر
طباعت	:	نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی
زیراہتمام	:	انصاری اطہر حسین

حالی پبلشنگ ہاؤس، 6/275 للتا پارک،
لکشمی نگر، دہلی۔110092

ملنے کے پتے:

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، علی گڑھ، ممبئی

☆ بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، بانکی پور، پٹنہ

www.urduchannel.in

انتساب

اپنی بیٹیوں

نبیل،تمثیل

داماد

بشیر

اور نواسی

انوشہ

کے نام

فہرست

نمبر شمار		صفحہ
1	کچھ اپنے بارے میں۔ سلیم انصاری	6
2	اقبال کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر	10
3	غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش	17
4	ستیہ پال آنند کا تخلیقی شعور اور عالمی عصری آگہی	23
5	مابعد جدید نظم۔ایک نا تمام جائزہ	30
6	۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری کے تخلیقی خدوخال	39
7	خاک خمیر کی تخلیقی کائنات	49
8	شموئل احمد کے ناول گرداب پر ایک نظر	59
9	مانک موتی کی تخلیقی اساس	70
10	لے سانس بھی آہستہ........ایک مطالعہ	77
11	وحشی سعید کے افسانوں میں زندگی کی تلاش	85
12	حیدر قریشی کے افسانوں کی حقیقت	95
13	دکن کی پیشی روغزلیں۔ایک مطالعہ	100
14	مے خانۂ اردو کا پیر مغاں۔ایک جائزہ	104
15	غضنفر کی شاعری سے ایک مکالمہ	110
16	خالد جمال کی شاعری کا فکری اور تخلیقی نظام	118
17	زندگی سے مکالمہ کرنے والا شاعر۔خوشبیر سنگھ شاد	127

www.urduchannel.in

18	ایک آنسو کہ جو آنکھوں کو منور کر دے	133
19	کبیر اجمل خوشگوار حیرتوں کا شاعر	140
20	نذیر فتح پوری کی نظم ۔ایک جائزہ	149
21	استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے......	158
22	اگلے پڑاؤ سے پہلے۔ایک خوشگوار تخلیقی تجربہ	164
23	ظفر گورکھپوری کی غزل نئے تخلیقی تناظر میں	173
24	عطا عابدی زخم' زندگی اور خواب کا شاعر	179
25	موج خیال کا فکری اور تخلیقی نظام	184
26	نئ تنقیدی جہات ۔ایک جائزہ	192
27	ایوانوں کے خوابیدہ چراغ پر ایک نظر	198
28	کوئی صورت تو خرابے میں نمو کی نکلے	207

کچھ اپنے بارے میں

سلیم انصاری

میرا تعلق ۱۹۸۰ کے بعد کی ادبی نسل سے ہے، جسے بعض ناقدینِ شعر و ادب نے مابعد جدید نسل سے موسوم کیا ہے اور میرا ایسا ماننا ہے کہ اس نسل نے اپنی پیش رو نسل سے الگ اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اپنے شعور و ادراک اور تجربات و محسوسات کی روشنی میں کیا ہے۔ میں بنیادی طور پر شاعر ہوں اور غزل و نظم ہر دو اصناف میں طبع آزمائی کرتا ہوں۔ غزلوں اور نظموں پر مشتمل میری شاعری کا اولین مجموعہ ''فصلِ آگہی'' ۱۹۹۶ میں شائع ہوا تھا جسے سنجیدہ ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پزیرائی حاصل ہوئی تھی جس سے میرے تخلیقی کاموں کو تقویت ملی تھی۔ میرے ادبی دوستوں کے مسلسل اصرار اور میری خواہش اور کوشش کے باوجود اب تک میری شاعری کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آسکا ہے، جس سے میری سست تخلیقی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے حالانکہ اب امید ہے کہ اس کتاب کے فوراً بعد ہی میری شاعری کی دوسری کتاب شائع ہو سکے گی۔

میری کتاب ''مطالعے کا سفر'' میرے ان مضامین کا انتخاب ہے جو وقتاً فوقتاً تحریر کئے گئے ہیں اور رسائل و جرائد میں شائع بھی ہوئے ہیں حالانکہ ان میں سے کئی مضامین اب تک رسائل و جرائد میں اشاعت سے محروم ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر مضامین میں نے اپنے ہم عصر تخلیق کاروں کی نگارشات پر تحریر کئے ہیں جو میرے ترجیحی مطالعے کا نتیجہ ہیں اور مجھے یہ خوشی بھی ہے کہ یہ مضامین نہ تو ضرورتاً لکھے گئے

www.urduchannel.in

ہیں اور نہ ہی کسی فرمائش اور سفارش پر بلکہ اپنے ذہن وضمیر کی روشنی میں کسی بھی ذہنی تحفظ کے بغیر لکھے گئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کتاب میں شامل میرے مضامین مروجہ تنقیدی اصول وضوابط کی کسوٹی پر کس قدر کھرے اترتے ہیں مگر یہ اطمینان ضرور ہے کہ میں نے ان مضامین میں کتابوں کے حقیقی مطالعے کے بعد ہی اپنے تاثرات اور ردِعمل کا اظہار کیا ہے۔

میں بنیادی طور پر خود کو شاعر ہی مانتا ہوں اور شاعر کی حیثیت سے ہی اپنی شناخت بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ خوش گمانی کبھی نہیں رہی کہ مجھ میں کوئی ناقد بھی پوشیدہ ہے۔مگر میری نثر نگاری کے پیچھے یہ بات ضرور ہے کہ میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہر ادبی نسل کو اپنا ناقد خود پیدا کرنا چاہیے،اس لحاظ سے میں شروع سے ہی اپنی ادبی نسل کی تخلیقی سمت ورفتار کا مطالعہ کرنے میں ایک طرح کی طمانیت محسوس کرتا رہا اور ان پر اپنے تاثرات اور ردِعمل کا بھی ظاہر کرتا رہا۔

میری اس کتاب میں کئی مضامین ۱۹۸۰ء کے بعد ایوانِ ادب میں اپنی موجودگی نمایاں طور پر درج کرانے والے تخلیق کاروں کے حوالے سے ہیں،ان میں سے غضنفر،خالد جمال،کبیر اجمل،عطا عابدی،شہناز نبی اور جاوید ندیم وغیرہ اہم ہیں، جن پر لکھ کر میں نے اپنی نسل کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھائی ہے،اس کے علاوہ ''مابعد جدید نظم۔ایک ناتمام جائزہ'' اور ''۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری کے تخلیقی خدوخال'' کے عنوان سے بھی دو مضامین شامل ہیں جن کے مطالعے سے مابعد جدید نسل کے کچھ اہم شعراء کی غزلوں اور نظموں کی سمت ورفتار اور امکانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اقبال اور غالب کے حوالے سے بھی دو مضامین اس کتاب کا حصہ ہیں،حالانکہ اب ان آفاقی شاعروں پر لکھنے کے لئے کچھ خاص نہیں رہ گیا ہے مگر میں نے اپنے طور پر کچھ

نئے زاویے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو یقینی طور پر نئی نسل کے قارئین کے لئے دلچسپی کا سبب ہوں گے۔

اردو کی نئی صدی میں ادھر کچھ عمدہ ناول بھی تخلیق کئے گئے ہیں اور بعض ناقدین اور ناول نگاروں کے نزدیک رواں صدی ناول کی صدی ہے،میں نے بھی اپنے ترجیحی مطالعے کی بنیاد پر ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' (نورالحسنین)، ''گرداب'' (شموئل احمد) اور ''لے سانس بھی آہستہ'' (مشرف عالم ذوقی) کے ناولوں پر اپنے تاثرات اور ردِعمل کو مضامین کی شکل میں رقم کرنے کی کوشش کی ہے،جو فکشن کے قارئین کے لئے توجہ طلب ہیں۔ستیہ پال آنند اور کرشن کمار طور کی شاعری پر میں نے مضامین نہایت عقیدت سے لکھے ہیں کہ یہ دونوں بزرگ ہماری پیش رو نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور کرشن کمار طور کے یہاں عشق کا تصور اور اس کی تہذیب کی پاکیزگی منفرد اور قلندرانہ ہے،جب کہ ستیہ پال کی نظموں میں غزل سے انحراف کا رویہ کارفرما ہے۔

آخر میں اپنے ان تمام دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکرگزار ہوں جن کے اصرار اور تقاضوں کے سبب ہی اس کتاب کی اشاعت کی یہ صورت نکل سکی ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ میں نہ تو کل وقتی تخلیق کار ہوں اور نہ ہی کل وقتی نثر نگار۔میں سائنس اور انجینئرنگ کا طالب علم رہا ہوں۔جبل پور انجینئرنگ کالج سے ۱۹۸۴ء میں سول انجینئرنگ(civil engineering) کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فی الحال مرکزی محکمۂ دفاع میں اکزیکیوٹو انجینئر (executive engineer) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہوں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہر دو تین برس کے بعد پورے ہندوستان میں تبادلوں کی صعوبتوں اور خانہ بدوشی کے باوجود میں نے اپنے اندر کے تخلیق کار اور نثر نگار کو بساط بھر بچانے کی کوشش

www.urduchannel.in

کی ہے، یہاں تک کہ میرا تبادلہ ناگالینڈ، آسام اور بنگال کے ان علاقوں میں بھی ہوا جہاں دور دور تک اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے تو کجا، اردو بولنے والے بھی نہیں ملے ۔ایسے ماحول میں اپنے اندر کی تخلیقی آگ اور ادبی ذوق کو بچائے رکھنا میرے لئے کسی کمال سے کم نہیں ۔ نامناسب ہوگا اگر میں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح دوست ساحر داؤدنگری کا شکریہ ادا نہ کروں جس نے ”مطالعے کا سفر“ کی اشاعت اور طباعت کے مختلف مراحل کو عبور کرنے میں میری پوری مدد کی ہے۔

اپنے دوست اور فکشن نگار ڈاکٹر محمد افسر خاں کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری خاطر خواہ معاونت فرمائی۔

☆☆☆

اقبال کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر

اقبال عظیم اور آفاقی شاعر ہیں، ان کے فکر وفن اور شخصیت پر ہر زاویہ سے لکھا جا چکا، اور مسلسل لکھا جا رہا ہے اور مستقبل میں بھی ان کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ بعض ناقدین شعروادب کا خیال ہے کہ اقبال کے فکر وفن پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں اور نہ ہی ان کی شاعری میں کسی نئے گوشے کی دریافت ممکن ہے۔ یہ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے مگر میرے نزدیک اقبال کی شاعری کبھی حل نہ ہونے والے ایک ایسے سوال کی طرح ہے جسے ہر مزاج اور مکتبۂ فکر کے لوگ اپنے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اقبال کبھی فلسفی ہیں، کبھی اسلامی مفکر اور دانشور نظر آتے ہیں، تو کبھی فطرت نگار، محبّ وطن اور نباض قوم دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی علامہ اقبال میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو ایک آفاقی اور عظیم شاعر میں ہونی چاہئیں۔ علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر وفن میں ایسی وسعت، گہرائی، تہ داری، انفرادیت اور آفاقیت ہے کہ ہر مزاج و مذاق کا انسان انہیں اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے اور اپنے طور پر اقبال کی تفہیم میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ پر لکھتے رہنے کا ایک طویل سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

www.urduchannel.in

چونکہ اقبال ایک عظیم شاعر، مفکر اور فلسفی ہیں، لہٰذا ان کے یہاں کئی سطحوں پر thought کا ایک پراسیس (process) مسلسل جاری رہتا ہے، جو کبھی انہیں مفکرِ اسلام بنا دیتا ہے، اور کبھی مصلحِ قوم اور سیاسی رہنما۔ اقبال کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ انہیں نظریۂ پاکستان کا بانی قرار دیا گیا اور چونکہ پاکستان کا قیام مذہب کے نام پر ہوا لہٰذا اقبال کی شاعری کے اس سرمایہ کو شعوری طور پر زیادہ شہرت دی گئی، جس کا تعلق اسلامی تہذیب و تمدن اور مذہبی فلسفے سے ہے، جس کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ اقبال سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں نے انہیں ایک خاص فرقے اور مذہب کا شاعر بنانے کی شعوری کوشش کی جس کے نتیجے میں اقبال کی شعری/فنی/فکری/تخلیقی عظمت اور آفاقیت، مفکرِ اسلام اور شاعرِ مشرق جیسے خطابات کے پیچھے چھپ گئی اس کے علاوہ ان کی شاعری کا وہ حصہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گیا جو جذبۂ حب الوطنی، انسان دوستی، ہندو مسلم اتحاد، امن و محبت اور بھائی چارگی سے عبارت ہے۔ بقول پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

''اقبال سچے ہندوستانی ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں، اپنی آفاقیت، بین قومیت اور گہری مذہبیت کے باوجود وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور اس کی مسرت و خوش حالی کے دل سے خواہاں اور ممکنہ حد تک کوشاں رہے۔ اقبال کا کلام ہندوستانیت سے بھرپور ہے، آپ ان کے کسی بھی مجموعۂ کلام کا مطالعہ کریں، ہندوستانیت کم یا زیادہ ملے گی ہی''

اقبال کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پہلے دور کی شاعری (یعنی ۱۹۰۵ء تک) میں حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور شاعری نسبتاً زیادہ ہے، جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اقبال نے جس عہد میں ہوش سنبھالا وہ ہندوستان کی غلامی کا زمانہ تھا اور اقبال غلامی کو، چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی ہو، شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اقبال آزادی کے حامی تھے اور ہر قیمت پر ہندوستان کی آزادی کے

خواہاں تھے۔ اقبال کے مطابق آزاد انسان ردِ عمل کے نئے چراغ روشن کر سکتا ہے صحت مند اور صالح فکر کی آزادی سے، انسان کو بہتر انسان بنایا جا سکتا ہے، جب کہ خام آزادئ فکر انسان کو حیوان بنا سکتی ہے۔

ہو بندہ آزاد اگر صاحب الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز

آزادئ افکار سے ہے ان کو تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

علامہ اقبال کی شاعری کثیر الجہت ہے، ان کے افکار و نظریات، کارزارِ حیات و کائنات کی متعدد دشاؤں میں منعکس ہوتے ہیں، ان کے یہاں ادب برائے زندگی کا نہیں بلکہ ادب برائے تعمیرِ زندگی کا تصور کارفرما نظر آتا ہے اور ان کا یہ تصور ان کی شاعری میں جا بہ جا محسوس کیا جا سکتا ہے، ان کی شاعری میں افادیت اور مقصدیت مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

www.urduchannel.in

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بہ خود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

اقبال کے یہاں فارم سے زیادہ فکر اہم ہے، وہ نہیں چاہتے کہ ان کے یہاں زبان و بیان، فنی خامیوں اور خوبیوں پر گفتگو کی جائے بلکہ وہ شاعری کو communication of thoughts کا وسیلہ سمجھتے ہیں، شاعری کو اپنی شاندار تہذیبی وراثتوں اور پیش رو نسلوں کی فکری توانائی کو نئی نسلوں میں منتقل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اقبال کو ایک خاص مذہب اور فرقہ کا شاعر بنا دینے والے لوگ بھی کسی نہ کسی سطح پر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کے عناصر موجود ہیں۔ اگر چہ یہ بات سچ ہے کہ ان کی شاعری میں حب الوطنی کے شدید جذبات کا اظہار ان کے یوروپ جانے سے قبل زیادہ ہوا ہے۔ اپنے قیام یوروپ کے دوران انہیں مغربی تہذیب وتمدن کے مطالعے کے مواقع میسر آئے اور انہوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور یوروپی معاشرے کی تہذیبی روایات کا تقابلی مطالعہ بھی کیا، جس کے نتیجے میں ان کی فکر کا کینوس بے حد وسیع ہو گیا اور انہوں نے حیات وکائنات کو ایک بالکل نئے نظریے سے دیکھنا شروع کیا۔

اقبال یوروپ میں قیام کے دوران مسلسل غور وفکر اور تہذیبوں کے تقابلی مطالعے کے زیر اثر اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں صدیوں پرانی تہذیبی روایتوں روراثتوں کے علاوہ اسلامی افکار ونظریات کے revival کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ہم اقبال کی شاعری کے کسی بھی دور کا مطالعہ کریں تو احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مٹی کی خوشبو

سے کسی نہ کسی سطح پر ان کی ذہنی وابستگی قائم رہتی ہے، اور یوروپ سے لوٹنے کے بعد اقبال کے یہاں قومیت اور وطنیت کا تصور جغرافیائی قید و بند سے نکل کر آفاقیت کے مدار میں داخل ہو گیا ہے۔ اپنی شدید حب الوطنی کے دور میں جہاں اقبال نے ترانۂ ہندی، ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، آفتاب اور نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھ کر اپنی وطن پرستی کا معیار قائم کیا وہیں یوروپ سے واپسی پر رام اور نانک جیسی شہرۂ آفاق نظمیں تخلیق کر کے ہندوستانی تہذیب وتمدن کی عظیم روایتوں اور وراثتوں سے اپنی وابستگی کو اور بھی صیقل کر دیا۔ نظم ہمالہ میں اقبال نے ہمالہ کی عظمت اور ہندوستان سے محبت کے گیت گائے ہیں۔

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اول فلک جس کا ہے وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل، دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دیوارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلامِ مہرِ عالم تاب پر

نظم ہندوستانی بچوں کا قومی گیت میں اقبال نے صوفیوں، سنتوں اور فقیروں کے حوالے سے اپنی وطنیت کے تصور کو پیش کیا ہے۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

نیا شوالہ میں اقبال لکھتے ہیں۔

www.urduchannel.in

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اپنے وطن کی خاک کے ہر ایک ذرہ کو دیوتا سمجھنے والے اقبال نے اپنی ایک نظم آفتاب میں گایتری منتر کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے جس سے ان کی وسعتِ ذہنی اور کشادگیٔ قلب ونظر کے علاوہ اپنی مٹّی اور اس کی تہذیبی وراثتوں سے وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوروپ سے واپسی پر اقبالؔ نے نانک اور رام جیسی نظمیں لکھ کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے مشترکہ تہذیب وکلچر کی ترویج واشاعت ہی دراصل ہندو مسلم اتحاد اور جمہوری قدروں کی بازیافت کا سبب بن سکتی ہے۔ نظم رام میں اقبالؔ نے شجاعت پاکیزگی اور محبت واخوت کے علمبردار رام کو زوال پزیر مغربی قوموں کے لئے قابلِ تقلید بتایا ہے۔

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

اپنی نظم نانک میں اقبالؔ فرماتے ہیں۔

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
برہمن سرشار ہے، اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بت کدہ پھر بعد مدّت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اقبالؔ کو احساس ہے کہ ہندوستان کے صوفیوں، سنتوں اور فقیروں نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ قومی یکجہتی، بھائی چارگی اور امن ومحبت کا پیغام دیا ہے، مگر ہم لوگ اپنی صدیوں پرانی تہذیبی وراثتوں کو کھوتے جا رہے ہیں جب کہ یہ تعلیمات سرحدوں کے حصار سے نکل کر مغرب میں فیض کا سرچشمہ بنی ہوئی ہیں۔ کاش ہم اقبالؔ کی شاعری کے بنیادی محرکات کو سمجھیں اور ان کی فکر اور پیغام کو صحیح تناظر میں اپنی زندگی کا لازمی حصّہ بنائیں۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش

غالب نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں اپنی تخلیقی فکر کے جوہر دکھائے ہیں،لیکن اپنی شاعری کے بارے میں ان کا یہ بیان کہ ”میرا فارسی کلام نقش ہائے رنگ رنگ سے معمور ہے جب کہ اردو کلام محض بے رنگ ہے“ کسی بھی سنجیدہ قاری کے لئے الجھن پیدا کرسکتا ہے کہ آیا غالب اپنی اردو شاعری میں اپنی پوری تخلیقی صداقتوں کے ساتھ موجود بھی ہیں یا نہیں، مگر یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کی اردو اور فارسی دونوں طرح کی شاعری کا سرچشمہ اور منبع تو ایک ہی ہے یعنی غالب کا تخلیقی ذہن۔البتہ یہ بات ضرور قابلِ قبول ہے کہ غالب اپنی فارسی شاعری میں زیادہ آسودہ (comfort) محسوس کرتے ہوں اسی لئے اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلہ میں کم تر گردانتے ہیں۔

ہمارے بعض ناقدین کو یہ شکایت بھی ہے کہ غالب کی اردو اور فارسی شاعری کا مجموعی مطالعہ اور تجزیہ نہیں کیا گیا جس سے ایک نقصان تو یہ ہوا کہ غالب کی ادبی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو رہ گئی، اس سے قطعِ نظر غالب کے تقریباً تمام ناقدین متفق ہیں

کہ غالب ایک فطری اور آفاقی شاعر ہے اور اس کی شاعری کا کینوس کثیر الجہت اور اس کے جذبوں کی ساری کیفیات رنگا رنگ ہے ۔غالب کی شاعری کے تقریباً تمام تر پہلوؤں پر لکھا جا چکا ہے پھر بھی ہر دور میں ناقدینِ شعر و ادب اپنے اپنے طور پر غالب کی شاعری کی تنقیدی تفہیم میں مصروف رہتے ہیں ۔غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش کرنے کی میری کوشش کہاں تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ تو قارئین کریں گے۔

امیجری دراصل ایک ایسی اصطلاح ہے جو انگریزی ادب کی تنقیدی تحریروں میں کثرت سے مستعمل ہے، اردو میں اس کا ترجمہ تصویر آفرینی، پیکر سازی اور پیکریت وغیرہ کے معنوں میں ہوتا ہے۔امیجری کے لغوی معنی لفظوں کی مدد سے تصویر بنانے کا عمل ہے۔ imagery is a picture out of words

گلوسری آف لٹریری ٹرمز (glosery of literary terms) میں ایم۔ ایچ۔ابراہم نے امیجری کی تعریف یوں بیان کی ہے۔

this term is one of the most common in modern criticism and one of the most variable in meaning.its application ranges all the way from the mental pictures which are experienced by the. readers.

یعنی امیجری نئی تنقید میں مستعمل ایک بے حد عام اور کثیر المعنی اصطلاح ہے جس کا اطلاق قاری کے ذہن پر بننے والی تصویروں پر ہوتا ہے ، اس کے علاوہ ایم۔ایچ۔ابرام کے نزدیک میٹا فور، سمبلی اور امیجری میں خاص فرق نہیں ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تشبیہ اور استعارہ پیکر سازی کے عمل میں تخلیقی سطح پر مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

امیجری کا تصور اردو ادب میں نیا نہیں ہے، اردو شاعری میں اس کا استعمال

www.urduchannel.in

متقدمین کے عہد سے ہوتا رہا ہے،قدیم شاعری میں امیجری کی جگہ محاکات کا چلن عام تھا۔یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ محاکات اور امیجری کے مابین بھی خاصا فرق ہے۔محاکات کسی چیز یا حالت کا اسطرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق امیجری یا تصویر آفرینی وہ عمل ہے جو محسوس اشیاء کو لفظوں کی مدد سے چشمِ احساس کے سامنے یوں لے آتی ہے،گویا آنکھوں کے سامنے مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

غالب ایک کامیاب مصورِ جذبات ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے فکری رجحانات ٹھوس سے مجرد کی طرف ہے،ان کے ذہنی رجحانات مادی زندگی اور اس کی سرشاریوں سے کتنے بھی قریب کیوں نہ ہوں وہ اپنی فنی اور فکری سطح پر مادے سے تجریدی کیفیتوں کی طرف مسلسل مائل بہ پرواز نظر آتے ہیں،غالب کی شاعری میں امیجری کی تلاش کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

تھا زندگی کو موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

سب کہاں کچھ لالۂ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں تصویر بظاہر visual یعنی مبصّر معلوم ہوتی ہے مگر شاعر نے صیاد دیدہ آہو کی کیفیت کے حوالے سے جو تصویر آفرینی کی ہے،وہ کسی صورت مرئی نہیں بلکہ اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے شعر میں غالب نے معلوم اور محسوس کی مدد سے موہوم اور معدوم کا تصور پیش کیا ہے،تیسرے شعر میں غالب نے اظہار کا نیا انداز اختیار کیا ہے ،انہوں نے زندگی اور موت کی حالت کو یکساں تصویر سے تعبیر کیا ہے،ان کے مطابق مرنے کے وقت ہی ان کا رنگ زرد نہیں پڑ گیا تھا،بلکہ موت کے خوف سے موت کے پہلے بھی ان کا رنگ زرد تھا،یہ ایک ایسی تصویر ہے جسے داخلی طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔چوتھے شعر میں غالب نے تمام پیاری پیاری تصویروں کے خاک میں مل جانے کے بعد،کچھ صورتوں کے لالۂ و گل کی صورت میں نمایاں ہونے کے عمل کو منفرد انداز میں مصور کیا ہے،بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اس شعر میں پیکر سازی کا عمل غیر مرئی سے مرئی کی طرف ہے لیکن حقیقتاً اس تصویر کا تعلق بھی محسوسات سے ہے۔پانچویں شعر میں غالب نے اپنے جوہرِ اندیشہ،یعنی اپنی ذات کے اندر گرمی اور سوزش کی شدت کی تصویر کشی کی ہے۔

ان مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ثابت کرنا نہیں ہے کہ غالب کے یہاں صرف مجرد امیجری ہے اور visual اور محسوس اشیاء کے علاوہ امیجری یا تصویر آفرینی کی دوسری اقسام سرے سے موجود ہی نہیں، بلکہ اشارات کی ایک ایسی فضا تیار کرنا ہے ،جس کی روشنی میں غالب کے یہاں پیکر سازی کے عمل کو مجموعی طور پر سمجھا جا سکے۔

غالب کی شاعری کے تفصیلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ایسی

www.urduchannel.in

تصویر آفرینی بھی ہے جس میں امیج images بالکل ٹھوس اور جسم و جان رکھنے والی ہوتی ہیں ، visual images کا تعلق ایسی تخلیقی تصویروں سے ہے ، جو آسانی سے حواس ، مطالعے اور مشاہدات کی گرفت میں آجاتی ہیں ۔ چند مثالیں حاضر ہیں

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ان اشعار میں حالات و کیفیات کو ذہن کے پردے پر منعکس کرنے کے لئے جو تصویریں بنائی گئی ہیں وہ قطعی ٹھوس اور محسوسات اور مشاہدات کی گرفت میں آنے والی ہیں ۔ محولہ بالا اشعار اور اس قبیل کے بہت سارے اشعار غالب کی شاعری سے حوالے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں ، جن میں غالب کا محبوب غیر مرئی نہیں بلکہ گوشت پوست کا انسان ہے ، اور غالب معاملہ بندی کے اظہار کے لئے اپنی تخلیقی

صلاحیتوں کو خارجی سطح پر بروئے کار لاتے ہیں ۔ غالب نے محبوب کی بے وفائی ، ہجر و وصال ، امید و ناامیدی اور زندگی کے دیگر مسائل کے اظہار کے لئے غیر شعوری طور پر امیجری کی کئی اقسام کا استعمال کیا ہے ، جس میں سادہ امیج ، مجرد امیج ، معنوی امیج اور منتشر امیج وغیرہ اہم ہیں ۔ غالب کے یہاں غزلوں میں ایجاز و اختصار اور خوب سے خوب تر بلکہ غیر معلوم کی جستجو اور غیر مانوس تخلیقی اصطلاحات کو برتنے کی تخلیقی ہنرمندی وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں ، جو غالب کے یہاں تصویر آفرینی اور پیکر سازی میں نہ صرف معاون ہیں بلکہ ان کی شاعری میں امیجری کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہیں ۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

ستیہ پال آنند کا تخلیقی شعور اور عالمی عصری آ گہی
(لہو بولتا ہے کی روشنی میں)

آزاد/نثری نظم اردو شاعری کی ایسی اصناف ہیں جو اپنے جنم سے لے کر آج تک معتوب ہی ٹھہری ہیں جس کی ایک وجہ تو غالباً یہ ہے کہ ہمارے بیشتر ناقدینِ شعر و ادب نے ذہنی طور پر غزل کی صدیوں پرانی تہذیبی روایتوں کے حصار سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی، دوسری وجہ ہمارے یہاں اچھے نظم نگاروں کا فقدان ہے۔ ہندوستان میں اردو شاعری کے تخلیقی سفر میں ن م راشد، میرا جی، قاضی سلیم، بشر نواز، شہر یار، مخمور سعیدی، بلراج کومل، محمد علوی، اختر الایمان، ندا فاضلی اور ستیہ پال آنند وغیرہ کے علاوہ عمدہ نظم نگاروں کی فہرست بہت طویل نہیں ہے جنہیں آزاد/نثری نظموں کے عالمی تخلیقی حوالوں میں خوداعتمادی کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔

نظم شاعری کی آفاقی صنفِ سخن ہے اور اظہار کا پاورفل میڈیم بھی لہٰذا بلا امتیاز زبان اور رنگ و نسل اگر ہم عالمی ادب پر گفتگو کریں تو ہمارا دائرہ نظم تک ہی محدود رہے گا، کیونکہ نظم ہی دنیا کی بیشتر زبانوں میں کسی نہ کسی فارم میں مشترکہ ذریعۂ اظہار ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تکلف نہیں کہ عالمی سطح پر اردو نظموں کو متعارف کرانے میں ستیہ پال آنند کی سنجیدہ کوششوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

''لہو بولتا ہے'' ستیہ پال آنند کی نظموں کا مجموعہ ہے جسے تفہیم و ترسیل کے عالمی

سیاق و سباق میں معتبر حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں نظمیں آفاقی اظہار کی تلاش از خود کرتی ہیں اور اپنا ڈکشن خود وضع کرتی ہیں۔ اردو نظموں کے حوالے سے اکثر یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ یہ ابھی تک خود کو غزلوں کے مروجہ ڈکشن اور طے شدہ مزاج سے آزاد نہیں کرسکی ہیں، جبکہ نظموں اور غزلوں کے مزاج ، موضوع اور تخلیقی فکر و اظہار کی سطح پر واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اگر ہم نظموں کے عالمی تناظر میں بات کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی اور دیگر یوروپی زبانوں میں تخلیق کی جانے والی نظموں کے موضوع اور اظہار کا کینوس وسیع ہوتا ہے جب کہ اردو نظموں کی صورتِ حال اس کے بر عکس ہے۔

ستیہ پال آنند کی نظموں کے سنجیدہ مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کے یہاں نظموں کی تخلیقی فضا میں ایک طرح کا کھلا پن ہے، ان کے ڈکشن میں نظموں کے مرکزی خیال کو مختلف جہتوں میں روشن کرنے کی صلاحیت ہے اور ان کی سوچ کی زیریں لہروں میں نظم کے ساتھ سفر کرنے کی ہنرمندی موجود ہے۔ ان کے یہاں جدید اردو نظموں میں مسلسل استعمال ہونے والے لفظ بھی ہر بار نئی معنویت خلق کرنے پر قادر ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا

''ستیہ پال آنند کی نظموں میں یہ موجودہ رویہ اپنی تمام تر گہرائی، سندرتا اور تنوع کے ساتھ اس طور پر سامنے آیا ہے کہ شاعر کے شعری امیجز حتیٰ کہ اس کی نظموں میں برتے جانے والے الفاظ بھی جیسے جاگ اٹھے ہوں۔''

ستیہ پال آنند کی فکری اساس ماضی بعید میں روشن اساطیری حوالوں اور ماضی قریب کے وسیع تجربات و مشاہدات کے علاوہ موجودہ عہد کی کرب ناک معاشرتی صورتِ حال اور مستقبل کی عرفان و آ گہی پر قائم ہے۔ اپنی نظموں کی تخلیقی صداقتوں کو روشن کرنے کے لئے ستیہ پال آنند کبھی ماضی کے اساطیری کرداروں اور حوالوں سے روشنی کشید کرتے ہیں تو کبھی اپنے بچپن کی معصوم یادوں اور تمناؤں کے تخلیقی عناصر کو

www.urduchannel.in

بروئے کار لاتے ہوئے اور کبھی تیزی سے تبدیل ہوتے عالمی منظر نامے ان کی شعری فکر وشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

''لہو بولتا ہے'' کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ستیہ پال آنند کی نظمیں جدید سے جدید تر کی طرف ایک معتبر پیش رفت ہیں۔ ان کی نظموں کا سفر اپنے عہد کے تخلیقی عوامل کا سفر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سفر ایک خوبصورت اور مضبوط تخلیقی علامت کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ سفر جو کبھی خارج سے باطن کی طرف ہوتا ہے اور کبھی داخلیت سے خارجیت کی طرف، ہر دو صورت میں ستیہ پال آنند اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عالمی منظر ناموں کی تشکیل وتعبیر کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم ''راستہ اور میں'' میں یوں رقم طراز ہیں۔

راستہ ہنس کر مجھے کہتا ہے، میں بھی
تو تمہارے ساتھ چلتا آ رہا ہوں
راستہ ہو تم یہیں ٹھہرے ہوئے ہو
چل سکتے ہو؟ میں پھر پوچھتا ہوں
راستہ کہتا ہے، اچھا یہ بتاؤ
اس طرح تم کب سے چلتے آ رہے ہو؟
کیا تمہیں احساس ہے ہر اک پڑاؤ تم کو منزل سا لگا ہے
عارضی دم بھر ٹھہرنے، سانس لینے کی جگہ سا
تم کہیں ٹھہرے نہیں ہو!
ورنہ میں یعنی تمہارا ہم سفر اس آبلہ پائی سے واقف
جو تمہارے پاؤں کا زیور ہے دیکھو
آج تک بڑھتا چلا آیا ہوں اب بھی
تازہ دم ہوں (نظم راستہ اور میں)

ستیہ پال آنند کی یہ نظم مکالماتی ہے جس میں راستہ، سفر اور مسافر تینوں لازم وملزوم ہیں۔ راستہ جو منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے، یہاں ہم سفر کی حیثیت سے نمودار ہوا ہے، جو مسافر کی صعوبتوں، مشکلوں اور جدوجہد سے واقف بھی ہے اور مسافر کو مسلسل سفر میں رہنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔

ان کے یہاں سفر کا ایک ایسا تصور بھی موجود ہے جس میں انسان اپنے وجود کے اندر گذشتہ یادوں اور لمحوں کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتا ہے، ان کی ایک نظم ''یہاں بیٹھیں رکیں دم بھر'' میں لمحوں کو پکڑنے اور تحلیل ہونے کے درمیان موجود اور سانس لیتی ہوئی نظم کا جواز پیش کیا گیا ہے۔

یہاں بیٹھیں رکیں دم بھر
ٹھہر کر سانس لیں
ستائیں دو گھڑیاں
کہ یہ لمحہ
ہمارا ماضی مطلق سے حالِ پا گریزاں تک
دبے پاؤں چلا آیا ہے
اپنے ساتھ چپکے سے
یہاں بیٹھیں ٹھہر کر سانس لیں، ستائیں دو گھڑیاں
کہ اس سے پیشتر یہ لمحۂ موجود
مستقبل کی جانب اک قدم آگے بڑھے
تحلیل ہو جائے
کہیں لا وقت کے ازلی تواتر میں

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ ستیہ پال آنند نے اپنی بعض نظموں کا خمیر ہندوستانی وراثت سے تیار کیا ہے، انہوں نے اساطیری کرداروں اور حوالوں کو نئے

www.urduchannel.in

عصری شعور و آگہی کے تناظر میں نئی معنویت سے آشنا کیا ہے۔مثال کے طور پر ان کی نظمیں قید دوام کا ساتھی، زندہ در گور بنتِ زمیں، میں جدِ امجد پتامہ بھیشم، نٹ راج، بالمیکی، سارتھی اہلیہ وغیرہ اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہیں۔قیدِ دوام کا ساتھی میں ستیہ پال آنند نے لکشمن ریکھا کو علامت بنا کر ایک ایسی عورت کے کرب وغم کو پیش کیا ہے جو اپنے محبوب کے انتظار میں یگوں یگوں سے اپنی لکشمن ریکھا کے دائرے میں قید ہے، یہاں لکشمن ریکھا عورت کے لئے جذب وایثار اور وفاداری کی علامت کو پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

مگر وہ گم سم
ڈری ہوئی کانپتی غزالہ سی
اپنی لکشمن لکیر کے دائرے کے اندر
کھڑی ہوئی اس اجاڑ رستے پہ ٹکٹکی باندھے
تک رہی تھی
نہ جانے کتنے یگوں سے کسی کی وہ منتظر تھی۔۔(قیدِ دوام کا ساتھی)

نظم ''زندہ در گور بنتِ زمیں'' میں ستیہ پال آنند نے رام، راون اور دشاسن جیسے اساطیری کرداروں کے حوالے سے یہ بات کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ دروپدی ہو کہ سیتا عورت ہر دور میں محکوم اور مظلوم رہی ہے۔''میں جدِ امجد پتامہ بھیشم'' میں انہوں نے مہان اساطیری کردار پتامہ بھیشم کے حوالے سے دو بھائیوں/دو ملکوں کے مابین رشتوں کے نشیب وفراز کو عصری تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ہندو پاک کے موجودہ سیاسی پس منظر میں ستیہ پال آنند کی یہ نظم رشتوں کی تفہیم کے نئے دریچے روشن کرتی ہے۔

جو راستے بند ہو گئے ہیں
جو قفل تم نے لگا دیے ہیں

میں آنے والے دنوں کے بابوں کی
چابیاں تم سے مانگتا ہوں۔ (نظم جدِ امجد پتامہ بھیشم)

ستیہ پال آنند کے تخلیقی فکر واحساس اور تجربات کی ایک کھڑکی ان کے بچپن کے آنگن میں کھلتی ہے۔وہ کبھی بچپن کی خود کلامی کی بازگشت سنتے ہیں اور کبھی اپنے بچپن کے آنگن میں کھوئی ہوئی پری شہزادی کی تلاش کرتے ہیں،انہیں اپنے بچپن کے گھر کے آنگن خوب یاد ہیں، جہاں آم کا پیڑ ہے اور اس کے پھلوں کا کھٹا میٹھا ذائقہ اب تک ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔اب جب ان کے بچوں کے قدم ان کے گھر کے کچے آنگن میں پڑے ہیں تو کچا آنگن سکڑ گیا ہے۔

مرے گھروندے کا کچا آنگن
جہاں میرے ننھے ننھے پاؤں کبھی پڑے تھے
جہاں پہ اب میرے اپنے بچوں کے پاؤں کے نقش پڑ رہے ہیں
وہ کچا آنگن سکڑ گیا تھا
پری کو شاید لگا تھا کم ہے زمین گھر کی
اسے کھلے گھر کی ہے ضرورت (نظم کھوئی ہوئی پری)

ستیہ پال آنند کا گمشدہ بچپن انہیں بار بار آواز دیتا ہے مگر شاید کسی کے لئے بھی اپنے بچپن میں واپس لوٹنا ممکن نہیں ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ بچپن کی خوبصورت یادیں، معصوم جذبے اور بے ضرر تمنائیں کسی بھی انسان کے لئے متاعِ بیش بہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بچپن سے جوانی کے گزرنے تک
کہیں گم ہو گئے تھے
اب انہیں ایک بار پھر ڈھونڈو
کہ ان گہرائیوں میں تارے اگتے ہیں

www.urduchannel.in

چمکتے موتیوں کی کھیتیاں ہیں
اور میں یعنی تمہارا گمشدہ بچپن
ابھی زندہ ہوں آؤ
میں تمہاری واپسی کا منتظر ہوں۔ (نظم تو تلے لفظوں کی بازگشت)

ستیہ پال آنند نظموں کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع ہے، اور تفصیلی مطالعے کی متقاضی ہے، ظاہر ہے ایک مختصر مضمون میں ان کی نظموں کے تمام تر پہلوؤں پر گفتگو ممکن نہیں، ان کے فکر و اظہار میں تنوع کے ساتھ ساتھ نئی علامتیں اور استعارات کے اختراع کا جو عمل ہے وہ انہیں عالمی عصری شعری تناظر میں ایک اہم نظم گو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے کا جواز بھی ہے۔

☆☆☆

مابعد جدید نظم۔ایک نا تمام جائزہ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی کسی بھی فعال اور زندہ زبان کے تخلیقی ادب میں انحراف و بغاوت اور ردّ و قبول کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور چونکہ اردو بھی ایک زندہ، متحرک اور سائنٹفک زبان ہے لہٰذا اس زبان کے تخلیقی ادب کا بھی نئے تجربات، تحریکات اور رجحانات کے ردّ و قبول کے عمل سے گذرنا ناگزیر ہے۔

ادب میں تحریکات اور رجحانات ہمیشہ جمود اور سنّاٹے کو نہ صرف توڑنے کا کام کرتے ہیں بلکہ ادب میں نئے امکانات اور نئی جہتوں کو روشن کرنے میں بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے ادب کے سیاسی یعنی مارکسی ایجنڈے سے انحراف کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جدید ادبی رجحانات سے تخلیق کاروں کو کم از کم یہ آسودگی تو میسر ہوئی کہ جدیدیت نے اپنا کوئی منشور نہیں بنایا، کوئی ریزولوشن پاس نہیں کیا، کوئی ہدایت نامہ جاری نہیں کیا بلکہ اس نے تخلیق کاروں کی مکمل ذہنی آزادی کی وکالت کی، اظہار کے غیر سیاسی اور غیر مشروط رویوں پر زور دیا اور یہ بات بھی کہی گئی کہ ادب اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے، اس طرح تخلیق کاروں کو ایک کھلی فضا کا احساس ہوا اور موضوعات اور فارم کی سطح پر نئے تجربات کے مواقع میسر آئے، اسکے علاوہ اسلوب کی سطح پر بھی نئے پن کا احساس ہونے لگا۔ مگر جدیدیت نے بھی رفتہ رفتہ وجودیت اور اجنبیت کے منشور کو غیر شعوری طور پر لاگو کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں ذات کے خول میں بند مایوسی، تنہائی، داخلی انتشار اور قنوطیت کے شکار جدیدیت گزیدہ تخلیق کاروں کا رشتہ نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی شعور و آگہی سے کٹ گیا بلکہ اس نام نہاد فیشن پرست جدیدیت سے بیزار ہو کر ادب کا

www.urduchannel.in

سنجیدہ قاری بھی کنارہ کش ہوگیا اور یہیں سے شروع ہوا جدیدیت کا زوال۔۔

چونکہ ادب میں ہمیشہ ردّ و قبول کا عمل جاری رہتا ہے لہٰذا زوال پزیر جدیدیت کے انحراف میں تخلیق کاروں کی ایک نئی نسل نے ،ایک بالکل نئے رجحان کے تحت لکھنا شروع کیا جسے مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔

مابعد جدیدیت کے بنیاد گزار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مطابق یہ ایک صورتِ حال ہے ”یہ کسی وحدانی نظریہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویوں کا، جس کی تہ میں بنیادی بات تخلیقی آزادی اور معنی پر بٹھائے ہوئے پہرے کو ردّ کرنا ہے“ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے علاوہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر وزیر آغا اور نظام صدّیقی وغیرہ نے بھی مابعد جدید تخلیقی رویوں اور اس کے بنیادی محرکات کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ڈاکٹر وہاب اشرفی کے مطابق مابعد جدیدیت ایک ایسی صورتِ حال ہے جس میں تخلیق کار یاسیت کی فضا سے نکل کر نئے سماجی اور ثقافتی ڈسکورس میں شامل ہوجاتا ہے اسکے علاوہ مابعد جدید تخلیق کار مکمل ذہنی آزادی کو روا رکھتا ہے اور طے شدہ فکری نہج کو قبول نہیں کرتا۔ مابعد جدیدیت جڑوں کی تلاش اور تہذیبی حوالوں کا احساس دلاتی ہے۔

بعض ناقدینِ ادب کا خیال ہے کہ ۱۹۸۰ کے آس پاس اپنا تخلیقی سفر شروع کرنے والی ادبی نسل کا سارا تخلیقی سرمایہ مابعد تخلیقی رویوں کے تحت وجود میں آیا ہے۔ مجھے اس بات سے پورا اتفاق نہیں ہے اور شاید میری اپنی نسل کے بہت سارے تخلیق کار اسے خود بھی تسلیم نہ کریں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۹۸۰ کے بعد کی نسل کے بیشتر شعراء کے یہاں مابعد جدیدیت ایک غالب رجحان کی شکل میں نمو پذیر ہوئی ہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ نئی نسل اپنی پیش رو نسل سے کئی معنوں میں مختلف اور منفرد ہے اس نسل کے اپنے مسائل ہیں، اپنے دکھ ہیں، اپنے تحفظات اور تعصّبات ہیں نیز عصری فکر و شعور کے اپنے زاویے ہیں اس کے علاوہ اس نسل نے سائبر اور

انٹرنیٹ عہد کے مسائل و مصائب کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

۱۹۸۰ کے بعد کی شاعری کا تخلیقی جواز فراہم کرتے ہوئے مابعد جدید نسل کے باخبر ناقد ڈاکٹر کوثر مظہری لکھتے ہیں ”آج کی نسل نے خود کو سمجھا ہے، معاشرے سے اپنی نسبت جوڑی ہے، اس کی شاعری کا مرکز اپنی فکر اور اپنا معاشرہ ہے، آج کی نسل جو شاعری کر رہی ہے اسکا رنگ اپنے پیش رووں سے جداگانہ ہے کیونکہ آج کی شاعری اپنی لفظیات خود وضع کر رہی ہے جس کے لئے اپنا منطقی جواز ہے۔“

یہ بات خوش آئند ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد کی ادبی نسل میں ایسے جینوئن تخلیق کاروں کی تعداد قابلِ لحاظ ہے جنہوں نے اپنی تخلیقی شناخت کے حوالے خود مرتب کئے ہیں اور اپنی نسل کی شاعری کی چھان پھٹک اور احتساب کی ذمہ داری بھی اسی نسل کے ناقدین نے قبول کی ہے جن میں ڈاکٹر کوثر مظہری، خورشید اکبر، جمال اویسی، خورشید حیات، ابراہیم اشک، ڈاکٹر مولیٰ بخش اسیر، نعمان شوق، آفاق احمد صدیقی، راشد انور راشد، ابرار رحمانی، مشتاق صدف، سرورالہدیٰ، معراج رعنا، سرور ساجد، عمران عظیم، احمد محفوظ اور عطا عابدی وغیرہ شامل ہیں۔

نظموں کے حوالے سے مابعد جدید نسل کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صورتِ حال قدرے تشویشناک ہے۔نظموں کی تخلیق میں سنجیدگی اختیار کرنے والے شعراء کی تعداد واقعی بہت کم ہے تاہم اس نسل میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جنہوں نے اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں موجودہ سائبر اور انٹرنیٹ عہد میں درپیش مسائل اور نجی محسوسات کو نظموں کے خوبصورت پیرہن میں بروئے کار لانے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے جس کی بہرطور ستائش ہونی چاہیے۔آج جبکہ دنیا ایک کمرے میں موبائل اور کمپیوٹر میں سمٹ کر رہ گئی ہے، انسان کے مسائل کی نوعیت بھی گذشتہ صدی کے مقابلے یکسر بدل گئی ہے، صارفی سماج میں پروڈکٹ ہی نہیں انسانی سوچ بھی گلوبلائز ہوگئی ہے آج کا انسان زیادہ باخبر اور informed

www.urduchannel.in

ہے جسکے نتیجے میں عمل اور ردِّ عمل کے مابین زمانی وقفہ لمحوں میں سمٹ گیا ہے، اب مابعد جدید تخلیق کار تنہائی، قنوطیت اور انتشار کا شکار نہیں اور نہ ہی اپنی ذات کے خول میں بند ہے۔ اب ہمارے عہد کا انسان تیز رفتار وقت کے ساتھ چلنا چاہتا ہے، وہ کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھ کر، سچائیوں کو اپنے طور پر قبول کرتا ہے اور مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہے۔ تیزی سے تبدیل ہوتی معاشی، سماجی اور بین الاقوامی صورتِ حال سے ہمارے عہد کا تخلیق کار بھی اچھوتا نہیں ہے، اب اسکی سوچ گلوبلائز ہوگئی ہے، جس کے اثرات اسکے تخلیقی فن پاروں میں بھی واضح طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مابعد جدید نسل کے تخلیق کاروں نے غیر مشروط ذہنی وابستگی کو ہی اپنا تخلیقی حوالہ بنایا ہے اور یہی اسکا سرمایہ بھی ہے۔

آج دنیا کے مختلف حصوں میں نسلی، مسلکی اور طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں رونما ہونے والے فسادات، تشدد اور انتہا پسندی کے علاوہ، کمزور ملکوں پر طاقتور ملکوں کے ذریعہ مسلط اقتصادی اور معاشی حکمرانی، جنگ و جدل کی عالمی سیاست، بے روزگاری، تلاشِ معاش کے لئے ہجرت، بے یقینی، بے سروسامانی کی حالت میں جائے اماں کی تلاش میں بھٹکتی انسانیت، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر ہونے والے بکھراؤ، کنکریٹ کے جنگل میں تبدیل ہوتی زرخیز مٹّی، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور گلوبل سرمایہ کاری کے عدم توازن کے سبب پیدا ہونے والی معاشی پریشانیوں سے نبرد آزما انسان کے مسائل کے آزادانہ اور فطری اظہار سے عبارت ہے مابعد جدید نظموں کا تخلیقی منظر نامہ۔۔

مابعد جدید نظموں کے تخلیقی حوالے سے ۱۹۸۰ کے بعد جو نام سامنے آئے ہیں ان میں عالم خورشید، خورشید اکبر، اکرام خاور، خورشید طلب، کوثر مظہری، جمال اویسی، غضنفر، جینت پرمار، ریاض لطیف، ابراہیم اشک، ساجد حمید، شاہد کلیم (مرحوم) شبنم عشائی، شاہد جمیل، عنبر بہرائچی، نعمان شوق، شیخ خالد کرار، معراج رعنا، راشد انور راشد، راشد جمال فاروقی، سہیل اختر، عذرا پروین، ترنم ریاض، عطا عابدی، مشتاق

صدف، خالد عبادی، امیر حمزہ ثاقب، شارق کیفی اور عطاء الرحمٰن وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں اسکے علاوہ بھی کئی اور نام ہیں جو اس فہرست میں نہیں آسکے کہ فہرست سازی اس مضمون کا مقصد نہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مابعد جدید نظم کا کینوس وسیع ہے، اسکے موضوعات زندگی سے عبارت ہیں، ان نظموں میں سیاسی، معاشی اور سماجی شعور و بصیرت کے تخلیقی حوالے ملتے ہیں، ان میں زندگی کے مختلف شیڈس ہیں، ان نظموں میں باطنی سچائی اور وجود کی آزادی کے اظہار کا حوصلہ ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد ادبی افق پر نمایاں ہونے والی نسل کے یہاں نہ تو اپنی پیش رو نسل کی فکر کا عکس ہے اور نہ ہی کسی نظریاتی وابستگی کا احساس ہوتا ہے بلکہ کھلے ذہن اور وسیع تناظر میں مشاہدات اور محسوسات کی ایک نئی تخلیقی سچائی کا احساس ہوتا ہے، اپنے اس خیال کی تائید میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک نہ ایک دن
گھر کے آگے
نیم کی شاخ پہ
ننگا کر کے لٹکا دوں گا تجھ کو منو
تیری رگوں کو چیر پھاڑ کے دیکھوں گا
تو نے پیا ہے کتنا لہو
میرے بزرگوں کا
ایک نہ ایک دن
تیری کھال ادھیڑوں گا
ہمیں تو صرف /برہمن، کھشتریہ اور ویشیہ کی
سیوا کرنا تو نے لکھا تھا

www.urduchannel.in

چمار بھنگی اور چانڈال کی تو نے لکھی تقدیر
گاؤں کے باہر رہنا/ٹوٹے برتن میں کھانا
یہاں کا بھینسہ بھی پنڈت
گدھا بھی گنگا جل پیتا ہے
لیکن تجھ کو ہے معلوم
اب میں نے چیل کی مانند اڑنا سیکھ لیا ہے
شیر کی مانند جست لگانا سیکھ لیا ہے
لفظوں کو ہتھیار بنانا سیکھ لیا ہے
ایک نہ ایک دن
تیری کھال ادھیڑ کے تیرے ہاتھ میں رکھ دوں گا
تو نے میرے باپ کو ننگا کر کے مارا تھا ایسے۔۔

(نظم منوجبینت پرمار)

اس نظم میں صدیوں پر محیط ذات پات اور طبقاتی فرق کے خلاف ایک شدید غم و غصہ کا اظہار ہے جسے بڑے کھلے پن اور حوصلہ مندی سے جبینت پرمار نے تخلیقی حوالہ بنا دیا ہے۔اور احتجاج کی اس سوچ کو نئی نسل کا وژن بنا دیا گیا ہے۔

اپنی نظم ''گوشت جلنے کی بو''میں راشد جمال فاروقی نے بھی احتجاج کا ایسا ہی رویہ اختیار کیا ہے۔

اس برس ہاں مگر
جنگلوں سے درندے برآمد ہوئے
پرسکوں بستیوں پر مسلط ہوئے
ایسا تانڈو ہوا
آگ جنگل کی شرما گئی

اور اب.....
گوشت جلنے کی بو سے مفر ہی نہیں

(نظم۔گوشت جلنے کی بو۔راشد جمال فاروقی)

خورشید اکبر کے یہاں سوچ کا کینوس وسیع ہے،سائبر عہد میں ساری دنیا کو ایک موبائل میں سمیٹ کر لانے والی سوشل سائٹ یعنی فیس بک کی بے یقینی کو پرچھائیوں سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی نظم فیس بک میں لکھتے ہیں۔۔

اب تو چہرے یقیں سے آگے ہیں
ہاں مگر اعتبار کس کا ہے.
سامنے میرے فیس بک رکھ دو
جی میں آتا ہے توڑ دوں درپن
روشنی ساتھ جب نہیں دیتی
ون پر چھائیوں سے بات کرے

(نظم۔فیس بک، خورشید اکبر)

نعمان شوق نے اپنی نظم امن میں عالمی سطح پر موجودہ سیاسی صورتِ حال کی بے یقینی کو اپنے نظریہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

امن
کچھ نہیں
صرف داشتہ ہے تمہاری
جو کسی پرائے مرد کے ساتھ
گذار لے ایک رات بھی
تو بن جاتی ہے جنگ...... (نظم۔امن۔نعمان شوق)

شیخ خالد کرار نے اپنی نظم سفر معکوس ہے میں نئی نسل کی بے یقینی،اور بے ثباتی کو

www.urduchannel.in

نہایت خوبصورتی سے مصور کیا ہے۔

ابھی تو ہم
خود اپنی ہی کھودی ہوئی سرنگیں
پاٹنے میں منہمک ہیں
ہمارے جسم
برگِ خزانی
ہماری رنگتیں دھانی
سفر معکوس، منزل بیکرانی
ہمارے خواب
سب پانی !!!

(نظم۔سفر معکوس ہے۔ شیخ خالد کرار)

دراصل نئی نسل کی یہی بے یقینی، بے زمینی اور بے بسی ہمارے عہد کا مقدر ہے اور اس سے نبرد آزما نسل کبھی کبھی زندگی سے لڑنے کا حوصلہ کھو دیتی ہے۔ اسی خیال کو جمال اویسی نے اپنی ایک نظم میں یوں پیش کیا ہے۔

خودکشی کرنے گیا اور نہیں کر پایا
اجنبی لوگ تھے
بازار تھا، ہنگامے تھے
ریل کی پٹری بہت گندی تھی
گھر سے نکلا تھا کہ مر جاؤں گا
کٹ جاؤں گا
بھیڑ کو دیکھ کے وحشت ہی ہوئی !

(نظم ۔۔ جمال اویسی)

اپنی نظم تکمیل میں امیر حمزہ ثاقب نے موجودہ سفاک عہد میں بکھرتے ٹوٹتے انسان کی نامراد خواہشوں اور ناکام آرزوؤں کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے

دیکھو کہ ٹوٹتا ہے مرا کیسے تارِ جاں
دیکھو، بدن کی خاک بکھرتی ہے کس طرح
بجھتے ہیں کس طرح سے دیے چشمِ خواب کے
ہوتا ہے کس طرح سے لہو کا شرار سرد
مرتی ہیں دل کی دھڑکنیں کس سوز و ساز سے
اڑتی ہے کیسے راکھ بدن کے دیار میں

(نظم ۔ تکمیل، امیر حمزہ ثاقب)

محولہ بالا نظموں کے اقتباسات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مابعد جدید نظموں کے ان شعراء کے یہاں موضوع کا تنوع ہے، جذبوں کی رنگارنگی ہے، محسوسات اور مشاہدات کی ایک وسیع کائنات آباد ہے، اسلوب اور اظہار میں سلیقہ مندی ہے، انسان کی ذات اور کائنات سے سروکار اور موجودہ عہد کی بے یقینی اور بیچارگی کے درمیان بکھرتے ٹوٹتے اور مسائل سے نبرد آزما ہونے کی حوصلہ مندی کے باوجود قنوطیت کے شکار آدمی کے جذبات کا اظہار کرنے کی ہنرمندی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان مابعد جدید نظموں میں علاماتی نظام تو ہے مگر یہ نظمیں ترسیل کے المیے کا شکار نہیں بس ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل کے ان تخلیق کاروں کی کاوشات کا ایمانداری سے تجزیہ کیا جائے اور ایوان ادب میں گونجتی ان پُر امید آوازوں کو شناخت کے عمل سے گذارا جائے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

۱۹۸۰ کے بعد کی شاعری کے تخلیقی خدوخال

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی بھی فعال اور زندہ زبان کے ادب میں انحراف و بغاوت اور ردوقبول کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ چونکہ اردو بھی ایک زندہ اور متحرک زبان ہے، لہٰذا اس زبان کے ادب کا بھی نئے تجربات، تحریکات اور رجحانات کے ردوقبول سے گزرنا ناگزیر ہے۔ ادب میں نئے تجربات اور رجحانات نہ صرف زبان کے سناٹے اور جمود کو توڑنے کا کام کرتے ہیں بلکہ ادب میں نئے امکانات اور نئی جہتوں کو بھی روشن کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کے سیاسی اور اشتراکی ایجنڈے سے انحراف کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جدیدیت کے رجحان سے تخلیق کار کو کم از کم یہ آسودگی میسر آئی کہ جدیدیت نے اپنا کوئی منشور نہیں بنایا، کوئی ریزولیوشن پاس نہیں کیا، کوئی ہدایت نامہ جاری نہیں کیا۔ جہاں ایک طرف جدیدیت نے فنکار کی مکمل ذہنی آزادی کی وکالت کی، آزادئ اظہار کے غیر سیاسی اور غیر مشروط رویوں پر زور دیا وہیں یہ بات بھی کہی گئی کہ ادب اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے۔ یعنی جدیدیت نے بھی رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر وجودیت اور اجنبیت کے ایجنڈے کو لاگو کرنا شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں ذات کے خول میں بند، مایوسی، تنہائی، داخلی انتشار اور قنوطیت کے شکار جدید تخلیق کاروں کا رشتہ نہ صرف اپنے عہد کی سیاسی، سماجی

اور تہذیبی شعور و آگہی سے کٹ گیا فیشن گزیدہ جدیدیت سے بیزار ہو کر سنجیدہ قاری ادب سے کٹ گیا اور یہیں سے شروع ہوا جدیدیت کا زوال۔

زوال آمادہ جدیدیت سے بیزار اور مایوس تخلیق کاروں کی نئی کھیپ نے ایک نئے ادبی رجحان کے تحت لکھنا شروع کیا، جسے مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا اور اس کے علمبردار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ ان کے مطابق مابعد جدیدیت ایک صورتِ حال ہے، یہ کسی ایک وحدانی نظریہ کا نام نہیں بلکہ یہ احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویوں کا، جن کی تہ میں بنیادی بات تخلیقی آزادی اور معنی پر بٹھائے ہوئے پہرے کو رد کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر وزیر آغا اور نظام صدیقی وغیرہ نے بھی مابعد جدیدیت کو ادب میں رائج کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے، مابعد جدیدیت کے بنیاد گزاروں کے نزدیک یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے جس میں تخلیق کار یاسیت کی فضا سے نکل کر نئے سماجی اور ثقافتی ڈسکورس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مابعد جدید تخلیق کار مکمل ذہنی آزادی کو روا رکھتا ہے اور طے شدہ فکری نہج کو قبول نہیں کرتا۔ مابعد جدیدیت جڑوں کی تلاش اور تہذیبی حوالوں کا احساس دلاتی ہے۔

بعض ناقدین شعر و ادب کا خیال ہے کہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس اپنا تخلیقی سفر شروع کرنے والی ادبی نسل کا سارا سرمایۂ ادب مابعد جدید رجحانات کے زیرِ اثر تخلیق ہوا ہے، اس سے جزوی اتفاق کرتے ہوئے مجھے یہ کہنا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد کی نسل کے یہاں مابعد جدیدیت ایک غالب رجحان کے طور پر کارفرما ہے لیکن یہ نسل اپنی پیش رو نسل سے کئی معنوں میں مختلف ہے، کمپیوٹر اور سائبر عہد کی تیز رفتار زندگی اور صارفیت کے زیرِ اثر پروان چڑھی اس نسل کے اپنے مسائل ہیں، اپنے دکھ ہیں، اپنے تحفظات اور تعصّبات ہیں نیز عصری شعور و آگہی اور تفہیم و ترسیل کے اپنے زاویے۔

۱۹۸۰ کے بعد کی شاعری کا جواز فراہم کرتے ہوئے نئی نسل کے باخبر نقاد کوثر مظہری نے لکھا ہے۔

www.urduchannel.in

”آج کی نسل نے خود کو سمجھا ہے۔معاشرے سے اپنی نسبت جوڑی ہے،ان کی شاعری کا مرکز اپنی فکر اور اپنا معاشرہ ہے،آج کی نسل جو شاعری کررہی ہے اس کا رنگ اپنے پیش رووں سے جداگانہ ہے کیونکہ آج کی شاعری اپنی لفظیات خود وضع کر رہی ہے،جس کے لئے اپنا منطقی جواز ہے۔“

یہ بات اطمینان بخش ہے کہ نئی نسل میں ایسے کئی تخلیق کار ہیں جنھوں نے اپنی نسل کے ذہین اور جینوئن تخلیق کاروں کی نشاندہی اور ان کی شاعری کے چھان پھٹک اور احتساب کی ذمے داری قبول کی ہے اور اس حوالے سے قابل قدر کام بھی کیا ہے۔جن میں ڈاکٹر کوثر مظہری،جمال اویسی،ڈاکٹر مولا بخش اسیر،خورشید اکبر،نعمان شوق،سرورالھدٰی،راشد انور راشد،عالم خورشید،آفاق عالم صدیقی،معراج رعنا،احمد محفوظ اور عطا عابدی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

نئی نسل کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خورشید اکبر لکھتے ہیں۔”اردو ادب میں ایک ذہین،حساس،اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہے ،جو تحقیق،تنقید اور تخلیق تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے۔یہ نئی کھیپ ماضی کے صحت منداقدار کی بازیافت،حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کے لئے مصروفِ ریاضت ہے۔“

ابراہیم اشک نے نئی نسل کے معنوی مسائل پر کارآمد گفتگو کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔”ایک ذہنی رویہ ختم ہونے پر،دوسرا ذہنی رویہ فوری طور پر یا کچھ عرصہ بعد جنم لیتا ہے،ہر نئی نسل کا ذہنی رویہ پرانی نسل سے زیادہ منفرد اور نیا ہوتا ہے“۔ابراہیم اشک کے مطابق ترقی پسندی اور جدیدیت کے زمانے میں معنیٰ آفرینی سے اردو کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا،اب برسوں بعد وہ رشتہ پھر جڑا ہے اور اعلیٰ ادب کے امکانات روشن دکھائی دینے لگے ہیں“۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ نئی نسل کو معنویت کی نسل سے تعبیر کرتے ہیں۔

نئی نسل کے قابلِ قدر ناقد اگرچہ اپنی نسل سے بہت زیادہ پرامید نہیں،تاہم انہیں یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ نئے شعراء نئے خیالات کا پرتو تو محسوس کرتے ہیں لیکن ان کی زبان نئے خیالات کے اظہار میں ساتھ نہیں دیتی۔جمال اویسی کی شکایت کسی حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ یہ بات سچ ہے کہ ہماری نسل کے شعراء میں نہ صرف مطالعے اور مشاہدے کا فقدان ہے بلکہ اپنی شہرت اور شناخت کے شارٹ کٹ میں تخلیقی ارتکاز و انہماک سے بھی ان شعراء کا کوئی تعلق نہیں رہا اور یہ ایک افسوس ناک صورتِ حال ہے جو کسی بھی طور قابلِ قبول نہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ ہماری نسل کے ناقدینِ شعروادب نے ۱۹۸۰ کے بعد کی ادبی نسل کی شاعری میں نہ صرف خامیوں اور تخلیقی بے راہ رویوں پر گرفت کی ہے بلکہ ان کے مختلف ذہنی،فکری اور تخلیقی رویوں پر بھی بامعنی گفتگو کی ہے،چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

راشد انور راشد کے مطابق.....”موجودہ عہد کی غزلوں میں تبدیلیوں کی آہٹ ہر لمحہ محسوس کی جاسکتی ہے،جو غزل کے مستقبل کی ضمانت ہے۔“

معراج رعنا کے لفظوں میں ..... ”۸۰ کے بعد والی نسل کو مابعد جدید کہنا اور اس کے شعری رویے کو جدیدیت مخالف تصور کرنا ،دراصل مابعد جدیدیت کے حامیوں کی سازش ہے۔نئی نسل کے شعراء کے اشعار سچائی منکشف کرنے میں ایک فعال کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔“

نعمان شوق کے مطابق.....”ایک سچے فنکار کو اپنے ذہن کے تمام دروازے کھلے رکھنے چاہیے،تاکہ تازہ افکار ونظریات سے نابلد نہ رہے۔لیکن اپنے قلم کو کسی خاص نظریے کا تابع نہیں بنانا چاہیے۔“

عالم خورشید کی رائے میں۔”میں شعروادب میں کسی رجحان،تحریک یا نظریے کا قائل نہیں،ادب تو ذہن کی آزاد اڑان ہے۔میں بھی وقت اور حالات کی تبدیلیوں کا

www.urduchannel.in

احترام کرتا ہوں۔''

شہپر رسول کے مطابق...."نئے شعراء کے بالکل نئے اور بدلے ہوئے طریق نے نئی غزل کے موضوعات،لفظیات اور اس کے مزاج میں جو ندرت،تازگی اور توانائی پیدا کی ہے وہ بھلی معلوم ہوتی ہے اور اہم بھی۔''

نئی شاعری کے حوالے سے نئی نسل کے تخلیق کاروں اور نقادوں کی محوّلہ بالا آرا کی روشنی میں اگر ہم نئی نسل کے تخلیقی سفر کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مابعد جدید شاعری میں فکر اور اسلوب کی سطح پر نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں،اگر چہ ہمارے کئی ناقدین کی نظر میں نئی شاعری کی موجودہ صورتِ حال بہت امید افزا نہیں مگر اس سچ سے بھی انکار ممکن نہیں کہ جدیدیت کی مبہم اور غیر یقینی ادبی فضا سے منحرف اور بیزار گمشدہ قاری کی بازیافت کا اہم کام ہمارے کئی شعراء نے کیا ہے،جس کے نتیجے میں ۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری نے اپنا رشتہ زمین سے استوار کرلیا ہے۔میرے نزدیک اس نسل نے ذات کی شکست وریخت اور تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کرلی ہے اور مکمل ذہنی آزادی کے ساتھ عصری مسائل ومصائب اور شعور وآگہی سے اپنی تخلیقی توانائی حاصل کی ہے۔۱۹۸۰ء کے بعد اپنی نمایاں شناخت قائم کرنے والے شعراء کے چند تخلیقی نمونے ملاحظہ کریں۔

اک بھیڑ مجھ سے منظرِ انکشاف تھی
میں تھا مراقبے میں مگر بے حضور تھا

عبدالاحد ساز

کوئی بھی لمحہ کبھی رائیگاں نہ جانے دیا
گزرتے وقت کی ہم نے بڑی حفاظت

ابراہیم اشک

ذرا جو عظمتِ رفتہ پہ حرف آنے لگے
تو اک بچی ہوئی محراب دیکھ لیتے ہیں

راشد جمال فاروقی

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کردیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

شہپر رسول

عجب مشکل ہے کہ آرام سے یہ دن گزرتے ہیں
کوئی ہمدرد ہوتا،آ کے میرا دکھ بڑھا جاتا

کوثر مظہری

انا ہی دوست ، انا ہی حریف ہے میری
اسی سے جنگ ، اسی کو سپر بھی کرنا ہے

ارشد عبدالحمید

مجھے نہ توڑ میں آئینۂ زمانہ ہوں
ہزار تجھ سے مناسب نہیں کہا میں نے

خورشید اکبر

آیا تھا میں کچھ اور ہی شے کی تلاش میں
الجھا دیا گیا مجھے فکرِ معاش میں

سہیل اختر

کھل گئے سارے دہانِ زخم اے فصلِ نمو
پھول کی صورت بدن کی خاک سے باہر نکل

عالم خورشید

www.urduchannel.in

اب کے موسم کا حال کیا کہیے
ہر پرندہ لہو میں تر آیا

فاروق انجینئر

چراغوں کو بجھے عرصہ ہوا ہے
ابھی تک ہم زیارت کر رہے ہیں

ملک زادہ جاوید

آنکھوں میں سب کی زندہ ہیں بے رمز رتجگے
کیا جانے ان کے ہاتھ سے کیا لے گیا کوئی

خالد جمال

وقت ہے حد سے پرے اپنی نظر ہونے کا
ورنہ امکاں کہاں دیوار میں در ہونے کا

عطا عابدی

کس نے کہا وجو د مرا خواب ہو گیا
میرا لہو تو آپ کی پوشاک ہو گیا

کبیر اجمل

شکم کی آگ نے جھلسا دیا تھا جسم و جمال
ہر ایک شخص پہ تھی بے حسی، انا چپ تھی

عمران عظیم

کتنے تارے آسماں سے گم ہوئے
میں کہاں دنیا سے پوشیدہ رہا

جمال اویسی

ساعتیں، صدیاں، تمدن منتظر میرے ریاض
اور اک میں ہوں کہ خود اپنے ہی اندر لا پتہ

ریاض لطیف

مجھ سے بہتر کون لکھّے گا بھلا تفسیرِ غم
میں نے ہر آیت پڑھی ہے درد کے قرآن کی

نعمان شوق

بھٹکتی ہے کہاں اے شامِ ہجراں
ہمارے گھر میں آ کوئی نہیں ہے

احمد محفوظ

شوق سے آئے برا وقت اگر آتا ہے
ہم کو ہر حال میں جینے کا ہنر آتا ہے

رسول ساقی

جب آنکھ اشکِ ندامت میں ڈوب جاتی ہے
دعا کا پیڑ بہت بار ور نکلتا ہے

طارق متین

رہتا ہے بدن اور کہیں روح کہیں اور
ہم خود بھی کہاں ہوتے ہیں حجرے میں ہمارے

خورشید طلب

گھٹن اندر ہی اندر مجھ کو زندہ دفن کر دے گی
حصارِ ذات سے باہر نکلنا چاہتا ہوں میں

راشد انور راشد

www.urduchannel.in

جس سے میں بھاگ رہا ہوں وہی زنجیرِ ہوس
مری نگاہ میں ہر آن رہا چاہتی ہے
اکرم نقاش

غور سے دیکھو شام کا تیکھا لہجہ ساجد
پھٹی پرانی کتابوں سے ملتا جلتا ہے
ساجد حمید

ہماری راہ میں ہیں دھوپ ریت اور پتھر
تمہارے حصے میں ہیں چاندنی، کلی، تتلی
عاصم شہنواز شبلی

ہے کون معتبر؟ کروں کس پر یقین میں
غاصب بنے وہی ، جنہیں سمجھا امین میں
جاوید ندیم

صدیوں سے مرے شہر کی تہذیب ہے عریاں
اچھا ہے مرے جسم پہ پوشاک نہیں ہے
سنجے مشرا شوق

کس کو ہے شوق یہاں در بہ دری کا امجد
چھت تھی کمزور مرے گھر کی تو گھر سے نکلے
غفران امجد

یہاں ان اشعار کو نقل کرنے کا مقصد نئی نسل کے تخلیق کاروں کی فہرست سازی قطعی نہیں، بلکہ یہ واضح کرنے کی کوشش ہے کہ اس نسل کے نمائندہ شاعروں کے یہاں فکر و اسلوب ہر دو سطح پر اپنے پیش رووں کے مقابلے نمایاں تبدیلی محسوس کی

جا سکتی ہے، اس نسل کے مسائل غیر مرئی نہیں، اس نے اپنی تخلیق کے لئے خام مواد اپنے گرد و پیش کے روزمرہ کے مسائل و مصائب سے حاصل کیا ہے۔ اس کے یہاں نہ تو ترقی پسندوں کی طرح گھن گرج ہے اور نہ ہی جدیدیوں کی طرح مبہم علاماتی نظامِ تخلیق۔ اس نسل کا لہجہ مثبت ہے اور زندگی سے مکالمہ کرنے کی حوصلہ مندی نے اسے منفرد قوتِ نمو عطا کی ہے۔ اس نسل نے اپنا رشتہ اپنی زمین اور اپنے معاشرے سے نہ صرف جوڑے رکھا ہے بلکہ اپنا تخلیقی سفر اپنے احساس و شعور کی روشنی میں شروع کیا ہے۔

اس نسل کا سب سے بڑا کارنامہ میرے نزدیک یہی ہے کہ اس نے کسی بھی طرح کی نظریاتی وابستگی اور سیاسی کمٹ منٹ کے بغیر نہایت خود اعتمادی کے ساتھ اپنے عہد کی تخلیقی سچائیوں کو بروئے کار لا کر نیا شعری منظر نامہ مرتب کیا ہے، جو لائقِ اعتراف بھی ہے اور قابلِ تحسین بھی۔ اب چونکہ یہ ادبی نسل تین چار دہائیوں سے اپنے تخلیقی سفر پہ رواں ہے، لہٰذا پیش رو نسل کے ناقدینِ شعر و ادب سے یہ مطالبہ غیر مناسب نہیں کہ چشم پوشی کی بجائے اس نسل کی تخلیقی صلاحیتوں کا غیر جانب دارانہ اور پر خلوص جائزہ لیا جائے، تاکہ ۱۹۸۰ء کے بعد تخلیق کئے گئے شعری سرمائے کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

خاک خمیر کی تخلیقی کائنات

انسانی تاریخ کے لامحدود سفر میں عشق ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے اور ہجر و وصل ایک فطری تجربہ۔ عشق کے بغیر کائنات کی ترسیل و ترویج اور تفہیم کا تصور ہی ممکن نہیں۔ لہٰذا انسانی زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں عشق کی کارفرمائی اور اس کے محرکات و ممکنات اور انسلاکات کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عشق کا یہ تصور جب کسی تخلیقی فنکار کی شعری سوچ کا حصہ بنتا ہے تو اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے حرف و لفظ کی پوری شعری کائنات پر پھیل جاتا ہے۔

کرشن کمار طور ہمارے عہد کے ان چند برگزیدہ تخلیق کاروں میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے عشق اور ہجر و وصل کا نیا محاورہ ایجاد کیا ہے اور اسے اپنی شاعری میں نئی جہتوں میں روشن کیا ہے۔ خاک خمیر ان کی شاعری کا تازہ ترین تخلیقی اظہار ہے، اس سے قبل ان کی شاعری کے دس سے زائد مجموعے منظرِ عام پر آکر ناقدینِ شعر و ادب سے خراجِ تحسین وصول کرچکے ہیں۔ کرشن کمار طور ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کی فکر کا کینوس بے حد وسیع ہے، ان کی شاعری میں اسلوب اور اظہار کی سطح پر اگرچہ کلاسیکی رچاؤ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، مگر لہجے کی تازہ کاری، منفرد ڈکشن اور انوکھی تراکیبِ لفظی کے علاوہ طرزِ اظہار کی شگفتگی اور اسلوب کی ندرت نے شاعری سے ان کے عشق کو نئے رنگ و آہنگ سے ہم کنار کردیا ہے۔ وہ ایک ایسے مست قلندر اور درویش صفت انسان ہیں، جس کا زیادہ تر شعری سفر بیرونِ ذات سے اندرونِ ذات کی طرف ہے اور خود آگہی اور خود آگاہی کے حوالے سے ان

کی ذات کا تخلیقی شناخت نامہ ہے۔ نام و نمود کی خواہش اور اردو مراکز سے دور برسوں کی تخلیقی ریاضت اور شعری مراقبے کے باوجود ناقدینِ شعر و ادب کی کم توجہی بھی انھیں اپنی وضع بدلنے پر مجبور نہ کرسکی اور یہی ایک سچے قلم کار کا منصب بھی ہے۔ ادب میں قدامت اور جدت کی مروجہ اور غیر ضروری بحثوں اور تضادات کی پرواہ کئے بغیر اپنے طور پر شعری سفر کرنے والے کرشن کمار طور کے یہاں عشق ایک طرح کی تخلیقی عبادت سے کم نہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ کرشن کمار طور کے یہاں غیر مانوس شعری اصطلاحات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے، جوان کے ہم عصر تخلیق کاروں کے یہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ یہ تراکیب اور اصطلاحات میرے نزدیک ان کے انفرادی فکری اور وجودی تجربات کا اہم حصہ ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی یہ اصطلاحات ادب کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں مکمل طور سے کامیاب ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری قدامت اور جدت کے ٹکراؤ اور کسی بھی نظریاتی انحراف اور تحفظات کے بغیر اپنے عہد کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو شاعری میں راست اظہار اور اسلوب کے اکہرے پن کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شعر کے عمودی اور فکری ارتقا کے لئے رمز و کنایہ اور ایہام وارتکاز ناگزیر ہے، اپنے شخصی تجربات و مشاہدات اور حقیقت کو مجاز میں تبدیل کرکے عصری جمالیات سے ہم آغوش کرنے کا نام ہی دراصل شاعری ہے، اور کرشن کمار طور اس فن میں پوری طرح کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔

اپنے مافی الضمیر کے تخلیقی اظہار کے لئے اکثر شاعروں کے یہاں کچھ ترجیحی اور کلیدی الفاظ ہوتے ہیں جو شاعری میں بار بار استعارات کی شکل میں نمو پزیر ہوتے ہیں اور اشعار کی تفہیم کے زاویے مقرر کرتے ہیں، کرشن کمار طور بھی اس سے مبرا نہیں، ان کے یہاں بھی ایسے کلیدی الفاظ وافر مقدار میں موجود ہیں جو اشعار کی معنویت اور

www.urduchannel.in

ان کی گہری فکری بصیرت کو مختلف دشاؤں میں روشن کرتے ہیں ۔عشق، ہجر، وصل، گماں، یقین، سفر، جنوں، دنیا، آئینہ اور دہر وغیرہ ایسے ہی کچھ الفاظ ہیں جنہیں ان کے شعری ڈکشن میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان لفظیات میں عشق ایک ایسا لفظ ہے جس نے ان کی شاعری کو نہ صرف منفرد تخلیقی جہت و ذائقے سے آشنا کیا ہے بلکہ غیر شعوری طور پر ان کی شاعری میں انفرادی اور اجتماعی شعور کے اظہار و ابلاغ اور ترسیل میں سرنامے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

وفورِ عشق سے کیا ہو گیا ہوں
میں خود ہی چہرہ خود ہی آئینہ ہوں

کچھ اس نے بھی رکھی تھیں حدیں عشق میں اپنی
کچھ ہم کو بھی اب وہم و گماں اور تھا ہونا

ہمیں تو کام فقط عشق کا ہی آتا تھا
یہ کاروبار نہ کرتے تو اور کیا کرتے

جو پیچ ہیں دنیا میں وہ اوروں کے لئے ہیں
اک گیسوئے پر خم سے ہمیں عشق بہت ہے

تیری پہچان کی خاطر جو مٹا دے خود کو
ایسا کرنے کے لئے ہو گا کوئی پیکرِ عشق

ہم ہی نہیں رہیں گے اگر اس جہان میں
پھر کس کے درمیان رہے گا اک ان کا عشق

نہیں ہے عشق اگر زندہ صفت سارے جہاں میں
ہمارے ہجر میں رنگِ وصال آیا کہاں سے

طریقِ عشق میں اپنے علاوہ اس کو بھی
گناہ گار نہ کرتے تو اور کیا کرتے

محولہ بالا اشعار میں نے کرشن کمار طور کے شعری مجموعے خاک خمیر سے سرسری طور پر ہی منتخب کئے ہیں۔ ان اشعار میں شاعر نے عشق کی مختلف کیفیات اور واردات کو انسانی نفسیات کے حوالے سے ایک وسیع کینوس پر اس طرح پینٹ کیا ہے کہ عشق ان کی شاعری میں غیر شعوری طور پر ایک انفرادی تجربے سے اجتماعی شعور کی طرف سفر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور بعض اوقات انکشافِ ذات اور قلبی و ذہنی سرشاری کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ انہوں نے عشق کے جن انسلاکات اور محرکات کو اپنے فن کی تخلیقی اساس پر رکھا ہے وہ ان کی شاعری میں امتیازات کے اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے اور ان کی جمالیاتی حس کو انگیز کرتا ہے۔ وہم و گمان سے ذات کے اثبات اور انکشاف تک کے وسیع سفر میں، چہرے سے آئینہ بننے تک، عشق کرشن کمار طور کے یہاں ہجر و وصل کے نئے معانی و مفاہیم کے ساتھ انسان کے پورے وجود میں پھیل کر بیکراں ہونے کا عمل ہے، لہٰذا یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عشق ان کے یہاں ایک ایسا داخلی اور فکر انگیز استعارہ ہے، جس نے ان کی تمام شاعری کو عشق زار بنا کر نئے ذائقے سے آشنا کر دیا ہے۔

www.urduchannel.in

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کرشن کمار طور کی شاعری میں رمز و کنایہ اور غیر مانوس تراکیب لفظی، منفرد استعارات و تشبیہات اور غیر مستعمل بحروں کی کارفرمائی بھی بہت ہے، مگر یہ بھی سچ ہے کے اتنے غیر مانوس تخلیقی اور شعری نظام کے باوجود ان کے یہاں تفہیمِ شعر کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مکرر قرأت سے اشعار کی معنویت کوئی دشاؤں میں منعکس کر کے مفاہیم کو نیا وژن عطا کرتا ہے۔

مجھے کرشن کمار طور کی شاعری کے مطالعے کا شرف برسوں سے حاصل رہا ہے، کبھی رسائل و جرائد کے صفحات پر کبھی براہِ راست ان کے شعری مجموعوں کے حوالے سے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ ان کی شاعری میں عشق ایک وسیع تر اور معنی خیز استعارہ ہے، مگر ان کے یہاں داخلی تجربات و محسوسات کی آمیزش سے ایک نئی اور پر اسرار شعری فضا قائم کرنے کا عمل شدید ہے، جو کئی بار ان کی خاموشی اور کلام کے درمیان پھیلی ہوئی بسیط و بے پناہ تخلیقی بصیرت و آگہی کی بشارت دیتا ہے، جو آخر کار ان کی شاعری میں ایک تجسس اور تحیر کی شکل میں منتج اور نمودار ہوتا ہے۔

مجھے دورانِ مطالعہ اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ ان کے یہاں نہ صرف خود سے مکالمہ کرنے کا جذبہ ہے بلکہ زندگی کے مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی ہے۔

کوئی بھرم مری تکمیل کا ضروری ہے
کرے نہ کیوں مرا افلاک مجھ کو گردش میں

جو کہ تھی وادیٔ اسرار ، اسے ڈھونڈ لیا
رکھ دیا سارے زمانے کو خبر میں ہم نے

تھی اس کی بزم میں موجودگی ضروری مگر
وہاں پہ ہم نہ تھے حاضر جہاں تھا کوئی اور

نکل پڑوں اگر اثبات کے طلسم سے میں
یہ اسم میرے نہیں کا نہیں ہے رہنے کا

میں اس کی آنکھ پہ پورا کبھی اترتا نہیں
مرے علاوہ اسے اور کچھ گماں بھی ہے

یقیں کو سمجھوں یہاں میں فقط اضافی شئے
کچھ اور طرح سے اب خانۂ گماں کھولوں

حیراں ہیں بھلا دنیا میں اب زندہ ہے کیسے
وہ شخص جسے خواہشِ دنیا بھی نہیں ہے

اک ذرا سا بھی نہ انکار مرے دل نے کیا
یہ مسافر بڑی جلدی سے سفر میں اترا

مایوسی، قنوطیت، یاس تنہائی موجودہ صارفی عہد میں زندگی کرتے ہوئے انسان کا مقدر ہے، اجنبیت، خودفراموشی اور عدم تکمیلیت اور نا آسودگی کے احساس نے موجودہ عہد میں انسان اور معاشرے کے درمیان ممکنہ رابطوں کو نہ صرف کمزور کیا ہے بلکہ تہذیبی قدروں کے زوال کے احساس اور اعتبار کو شدید ہی کیا ہے، اور شاید یہی سارے موضوعات ہمارے عہد کی شاعری میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، مگر کرشن کمار طور کی شاعری کے کینوس پر زندگی کے مثبت رنگوں اور جذبوں سے بنائی ہوئی تصویروں میں دلکشی اور شگفتگی کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں

www.urduchannel.in

اثبات ہے،امکان ہے،خواب ہیں اور یقین ہے۔وہ اپنی شاعری میں جہاں نظر آتے ہیں وہاں نہیں ہیں،ان کے یہاں شاعری میں ایک ایسے عام آدمی کو پیکر کیا گیا ہے جسے خواہشِ دنیا تو نہیں مگر وہ اپنے خانۂ گماں کو ایک بالکل نئی طرح سے کھول کر اس کے اندر سے یقین کو کشید کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی انفرادیت کرشن کمار طور کی شاعری کی قرأت کو ایک نئے زاویے سے کرنے کا نہ صرف مطالبہ کرتی ہے، بلکہ قاری کو ایک طلسمِ خانۂ معانی میں لے جاتی ہے،جہاں وہ ذہنی آسودگی اور سرشاری کے نئے موسموں اور منظروں سے ہم آغوش اور ہم آہنگ ہوتا ہے،جو میرے نزدیک اچھی اور عمدہ شاعری کا جواز بھی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ کرشن کمار طور کے یہاں اشعار میں منفرد تراکیبِ لفظی اور نئی شعری اصطلاحات کا خاص التزام پایا جاتا ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ فنی نظام ان کے یہاں بغیر کسی تصنع اور شعوری کوشش کے فطری طور پر ہی ان کے تخلیقی عمل کا حصہ بنتا ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ ناقدینِ شعر و ادب کرشن کمار طور کی شاعری کو ادب کے کس خانے میں رکھتے ہوں گے، یا جدید شاعری کے مطالبات اور تقاضے کیا ہونے چاہئیں، مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ اچھی شاعری وہ ہے جو قاری کے ذہن و دل پر مثبت اثرات مرتب کرے اور اسے آسودگی اور سرشاری سے ہم آغوش کرے،اس اعتبار سے دیکھیں تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ کرشن کمار کی شاعری کی غیر مشروط قرأت قاری کو ذہنی سرشاری سے ہم کنار کرتی ہے ۔میں چونکہ ان کی شاعری کا دیرینہ قاری ہوں اور میں نے ان کی شاعری کا توجہ اور دلچسپی سے بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے،لہٰذا یہ بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی شاعری کے بنیادی اسٹرکچر پر موسموں کے سرد و گرم کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے،یعنی ادب میں ہونے والے تغیرات اور تحریکات ان کی تخلیقی سوچ اور اسلوب و بیان پر اثر انداز ہونے میں ناکام رہے ہیں اور شاعری سے ان کا یہ کمٹمنٹ قابلِ تحسین ہے،وہ اردو

ادب کے ایک ایسے درویش ہیں جو برسوں سے اپنے حجرے میں باہر کے موسموں سے بے خبر دھونی رمائے بیٹھا ہے۔

کبھی کسی سے طلب کرتے ہیں کہاں درویش
صدائیں دیتے ہی رہتے ہیں بے گماں درویش

وجودِ دہر پہ بس اک نگاہ ڈالتے ہیں
ہیں رکھتے ماتھے پہ خوش ہو کے ہر زیاں درویش

سنتا ہی نہیں کوئی کسی کی تو یہاں پر
درویش کی ہو عرضی سفاک کہ ہم ہوں

دنیا سے ان کی یہ بے خبری بلکہ بے ربطگی انہیں درونِ ذات کے تمام موسموں اور منظروں کے حوالے سے خارجی دنیا کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرتی ہے،اور اپنے اس مراقبے سے وہ ایک بالکل نئے طرح کا تخلیقی مواد حاصل کر کے واپس لوٹتے ہیں۔دنیا جو انسانوں کے لئے ایک عارضی سرائے ہے مگر انسان اپنی جبلی خواہشوں کی تکمیل کی کوشش میں دن رات نہ صرف سرگرداں رہتا ہے بلکہ نا آسودگی کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے وہ مرنا تک بھول جاتا ہے۔یہ زندگی کے تئیں ایک عام آدمی کا نظریہ ہوسکتا ہے۔مگر اہلِ نظر اور درویش صفت انسان دنیا کو دشمن کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی نہ صرف مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں بلکہ دنیا سے فرار کی راہ بھی اختیار کرتے رہتے ہیں۔کرشن کمار طور کے یہاں ایسے بہت سارے اشعار مل جاتے ہیں جن میں دنیا کے لفظ کو استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے مگر اصل میں اس سے زندگی کے خارجی عوامل کی افہام و تفہیم کا نیا محاورہ وضع کیا گیا ہے۔ان کے یہاں ہاں اور نہیں،اثبات و نفی

www.urduchannel.in

بظاہر سب ایک ہی ہیں اور زندگی کے گہرے فلسفے کے بطن سے پیدا ہونے والے امکان و انکشافات کا نہ صرف مظہر ہیں بلکہ عام انسانی تجربات کے ناقابلِ فہم ہونے کا بھی احساس دلاتے ہیں۔

ہے چکا چوندھ تماشے سے مزین سب کچھ
ایک دنیا کو بسا رکھا ہے گھر میں ہم نے

مٹی کی طرف ہاتھ نہ پھیلائے کبھی بھی
ہم نے تو کبھی جانبِ دنیا نہیں دیکھا

اس سر کو اٹھانے میں کی ہم نے بھی تاخیر
دنیا نے بھی کچھ اپنا ستم دیر سے رکھا

نکل بھی آتے ہیں دنیا کے دائرے سے ہم
ہیں چاہتے بھی کسی انتساب میں رہنا

کچھ ہم پہ بھی دنیا کا بہت خوف ہے طاری
کچھ ان دنوں اس کی بھی ادا ٹھیک نہیں ہے

دنیا کے افق میں ہی ہوئے جاتے ہیں مدغم
ہم لوگ کہاں رکھتے ہیں دن رات الگ سے

بس ایک پل کا تماشہ ہے سامنے کی چیز

میں کیا کہوں کہ یہ دنیا ہے سامنے کی چیز

اس قبیل کے اور بھی بہت سے اشعار خاک خمیر سے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں مگر مضمون کی طوالت کے سبب اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں، اپنی اس رائے کے ساتھ کہ کرشن کمار طور کے یہاں دنیا استعارے سے زیادہ ایک ایسے روشن دان کی حیثیت رکھتی ہے جس سے وہ اندرونِ ذات کے علاوہ بیرونِ ذات کے مناظر بھی نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں تخلیقی سوچ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس مضمون میں ان کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ انہوں نے اپنا مخصوص ڈکشن از خود وضع کیا ہے اور کسی بھی شاعر کے لئے یہ ایک بڑی بات ہے، اس لحاظ سے بھی کہ یہی ڈکشن اس کی تخلیقی شناخت کا معتبر حوالہ بھی ہوتا ہے۔ کرشن کمار طور اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں سے اکثر تخلیق کار واپسی کا سفر شروع کر دیتے ہیں مگر کرشن کمار طور ان خوش نصیب تخلیق کاروں میں ہیں جن کے یہاں اب بھی فکر اور اظہار کی سطح پر ایک طرح کی تازہ کاری اور شگفتگی ہے، نوع بہ نوع مضامین ان کے شاعری میں ایک تواتر اور تسلسل سے محسوس کئے جا سکتے ہیں، جس کے لئے وہ یقینی طور پر قابلِ مبارک باد ہیں کہ ابھی ان کی فکر کا سوتا جاری اور رواں دواں ہے۔

شاعری جتنی ہوئی اس کے حوالے سے ہوئی
اس کا اک نام مرے سارے ہنر میں اترا

☆☆☆

www.urduchannel.in

شموئل احمد کے ناول ''گرداب'' پر ایک نظر

''گرداب''،شموئل احمد کا نیا ناول ہے اس سے قبل انکے تین ناول ندی، مہاماری اور ''اے دلِ آوارہ'' منصۂ شہود پر آ کر ناقدینِ ادب سے خراج حاصل کر چکے ہیں ۔شموئل احمد ایک ایسے versatile تخلیق کار ہیں جو بیک وقت کئی سطحوں پر فکر و عمل اور تخلیق میں مصروف رہتے ہیں اور چونکہ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک سول انجینئر ہیں لہٰذا انکی تخلیقات میں ایجاز واختصار کے ساتھ اظہار میں precision اور accuracy کو بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اپنے مطالعے، مشاہدے، تجربات اور محسوسات کو بنیاد بنا کر اپنی زندگی رنگ تخلیقی کائنات کو منور کرنے والے شموئل احمد کے یہاں مرد اور عورت کے درمیان جسمانی اور روحانی رشتوں کی سچائی اور تقدس کے اظہار کی خوش سلیقگی اور ہنرمندی ہی انکا تخلیقی وصف ہے۔ میں نے انکے پہلے تینوں ناول نہیں پڑھے ہیں مگر ان پر ہونے والے

مباحث سے میرے اس خیال کو تقویت ملی کہ انکا سیاسی ،سماجی اور تہذیبی شعور اور بصیرت انکی تخلیقات میں زندگی کی علامت بن جاتے ہیں، اسکے علاوہ عورت کے اندر ایک نئی عورت کی تلاش انہیں صنف نازک کی جنسی نفسیات اور پیچیدگیوں کی تفہیم اور ترسیل پر آمادہ کرتی ہے، یوں تو شموئل احمد کے افسانے ایک عرصہ سے ادب کے سنجیدہ قارئین کے مطالعے کا حصہ بنتے رہے ہیں مگر سنگھاردان کی اشاعت کے بعد ان کے افسانوں کی تفہیم کا نیا رویہ سامنے آیا ہے، اور پھر اونٹ نے تو کمال ہی کر دیا، ان پر جنسی موضوعات کو شدت سے برتنے کا الزام ہی عائد کر دیا، مگر اس حقیقت کا کیا کیا جائے کہ مرد و عورت کے درمیان جنسی رشتہ فطری ضرورت اور عالمگیر تہذیبی صداقت ہے، شرط ہے اس موضوع کو سلیقے اور ہنرمندی سے برتنے کی۔

زیرِ نظر ناول گرداب بھی عورت اور مرد کے درمیان نامعلوم جنسی رشتوں کی ضرورت اور اسکی نفسیات پر مبنی ہے، جو جسم سے شروع ہو کر ذہن اور پھر روح تک پھیلتا چلا جاتا ہے، مگر اپنی تمام تر پیچیدگیوں اور الجھنوں کے ساتھ۔ یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ شموئل احمد ایک ماہر نجومی (پامسٹ) اور ٹیرو کارڈ ریڈر (reader) ہیں لہٰذا اپنے افسانوں اور ناولوں میں اپنی اس علمی لیاقت اور مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے کرداروں کی کنڈلی یا زائچہ بنا کر اس کے ستاروں کی چال اور انکی پوزیشن کے اعتبار سے رنگ بھرنے میں ماہر ہیں جس سے انکی تخلیقات کے نئے مظاہر سامنے آتے ہیں اور انکی کہانیوں کا کینوس کئی دشاؤں میں روشن ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر ناول گرداب کی کہانی بھی مرد و عورت کے درمیان جنسی ضرورت اور اسکی نفسیات کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے، اپنے اس ناول میں بھی انہوں نے پامسٹری کے علم کا استعمال نہایت عمدگی اور ہنرمندی سے کیا ہے، بلکہ گرداب کے سب سے زیادہ مظبوط کردار ساجی سے انکی ملاقات اور رشتہ کا ذریعہ بھی انکا یہی علم ہے۔ دراصل ناول کا مرکزی کردار جو واحد متکلم ہے، جو ناول نگار بھی ہوسکتا ہے، صوبائی حکومت میں

www.urduchannel.in

ملازم ہے اور اسکا تبادلہ اکثر بہار کے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں ہوتا رہتا ہے لہٰذا وہ اپنی بیوی اور بچوں کو پٹنہ میں ہی رکھ کر خود آنا جانا کرتا ہے، اس بار اسکا تبادلہ لال گنج میں ہو جاتا ہے جہاں کرائے کے مکان لیتے ہوئے اسکی ملاقات ساجی سے ہو جاتی ہے جو مالک مکان کی بیوی ہے۔ ساجی ناول کا ایک ایسا ضروری کردار ہے جو کہانی کا لازمی حصہ ہے اور اس ساتھ ساتھ آخر تک سفر کرتا ہے اور جس کے بغیر کہانی کا تصور بھی ممکن نہیں، شموئل احمد کا کمالِ فن یہ ہے کہ انہوں نے ساجی کے کردار کو نہایت ہنر مندی اور چابکدستی سے تراشا ہے،

ناول میں ساجی کو ایک کم پڑھی لکھی عورت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس کے پیچھے ناول نگار کی کیا سوچ ہے اس کا اندازہ ناول کو پورا پڑھنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کہانی کے مطابق ساجی کی شادی ایک ایسے گھر میں ہوئی ہے جہاں سارے لوگ مڈل فیل ہیں مگر شادی سے پہلے خود کو تعلیم یافتہ ظاہر کرتے ہیں خود اسکا شوہر یعنی درجات بھی کم پڑھا لکھا ہے اور ساجی سے یہ جھوٹ بھی بولتا ہے کہ اسکے پاس کتابوں سے بھری الماری ہے، لیکن سچائی یہ ہے کہ ایک اخبار تک گھر میں نہیں آتا شاید اسی لئے درجات کے کردار کو احمق، بیوقوف، گاؤدی اور کم آئی کیو والے شخص کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ناول کے مرکزی کردار سے ساجی کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنی کنڈلی میں ستاروں کا حال جاننے کے لئے آئی تھی مگر ناول نگار کچھ حال بتا کر اس کی کنڈلی کے نامکمل ہونے کی بات کہتا ہے اور خود صحیح کنڈلی بنانے کا وعدہ بھی کرتا ہے، اور یہ تعجب بھی کرتا ہے کہ اسے ناول نگار کے نجومی ہونے کی بات کیسے معلوم ہوئی؟۔ درجات نے انکشاف کرتا ہے اسے ناول نگار کے آفس کے ہیڈ کلرک نے یہ جانکاری دی، مگر درجات سے ہیڈ کلرک کی ملاقات کہاں، کب اور کیسے ہوئی یہ پتہ نہیں چلتا؟۔ پھر ساجی سے دوسری اور باقاعدہ ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی بیٹی رینو کی کنڈلی دکھانے آتی ہے اور اس بار اسکا شوہر ساتھ نہیں ہوتا، اور یہیں

سے ساجی اور ناول کے مرکزی کردار کے درمیان ایک بے نام سی قربت کا آغاز ہوتا ہے، ساجی کے ساتھ تنہائی میں کچھ وقت گذار کر اسے احساس ہوتا ہے کہ پانچ بچے جننے کے بعد بھی ساجی کے اندر کی عورت مری نہیں تھی، وہ سادہ لوح اور معصوم تھی، وہ ساجی کو چھونا چاہتا ہے اور یہیں سے ساجی کی زندگی میں موجود ادھورے پن اور خالی پن کے اندھیروں کو بھرنے کیلئے جسمانی رشتوں اور ضرورت کے لئے ناول میں سازگار ماحول بنانے لگتا ہے۔ ناول کے صفحہ ۱۴ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرے لئے اس عورت کو چھونا آسان ہے۔ ہر عورت اپنے لاشعور کے نہاں خانوں میں ایک مثالی مرد کی تصویر سجائے رکھتی ہے۔ وہ اس شخص سے قربت محسوس کرتی ہے جس میں مثالی شبیہ نظر آتی ہے، ظاہر ہے درجات میں یہ خوبیاں برائے نام بھی نہیں تھیں اور مجھ میں.........؟ میرے پاس کتابوں سے بھری شیلف تھی۔ میں اسکی نظر میں ہیرو تھا.....اعلا درجے کا رئیس....ایک ہاتھ میں کتاب .....انگلیوں میں سگریٹ......خدمت گذار پاؤں دباتے ہوئے اور جالیوں سے تکتی وہ.....!''

ناول کے مرکزی کردار اور ساجی کے درمیان قائم ہوتے رشتوں نے کئی آسانیاں بھی فراہم کردی ہیں، اب اسکے لئے چائے، ناشتہ اور کھانا وغیرہ بھی گاہے بگاہے ساجی کے یہاں سے آنے لگا ہے، اور اسکے کپڑے وغیرہ بھی ساجی کے یہاں دھلنے لگے ہیں۔

ناول کا مرکزی خیال عورت اور مرد کے درمیان گمشدہ رشتوں کی تلاش اور اس کی بازیافت پر مبنی ہے اور یہ رشتہ ناول میں کئی سطحوں پر نمودار ہوتا ہے، ناول نگار اپنی بیوی نصیب سے بھی بہت محبت کرتا ہے، جو پٹنہ میں اپنے دو بچوں سیفی اور کیفی کے ساتھ رہتی ہے۔ مگر ساجی سے اسکے رشتوں کی نوعیت کیا ہے؟۔ کیا یہ محض جنسی اور جبلی خواہشوں کی تکمیل کی کوشش ہے،؟ کیا یہ رشتہ ناول نگار کی اپنی ذاتی زندگی میں کسی کمی یا ناآسودگی کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوتا ہے، یا پھر اس رشتے میں کوئی دوسرا پہلو بھی تلاش

www.urduchannel.in

کیا جا سکتا ہے،اسکا جواب ناول کے مطالعے سے واضح طور پر مل جاتا ہے۔چند جملے ملاحظہ فرمائیں۔

میں صرف دوستی چاہتی ہوں......اور بس.......!	صفحہ ۲۷
ایک دیا آپ کے نام کا بھی جلاؤں گی۔	صفحہ ۳۸
میں جانتی ہوں آپ میرے دوست نہیں ہو سکتے	صفحہ ۴۸
میں صرف دوستی چاہتی ہوں۔	صفحہ ۴۹
آپ حد سے گذرنا چاہتے ہیں مگر میں شادی شدہ ہوں	صفحہ ۴۹

ان جملوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ساجی اپنی زندگی کے خالی پن اور ادھورے پن کو تو بھرنا چاہتی ہے مگر جسم کی قیمت پر نہیں مگر کمار جو ساجی کا نہ صرف مجازی ہیرو ہے بلکہ اسکا آدرش بھی ہے،اسکے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا ہوتا ہے وہ ساجی کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ دوستی اگر دل سے ہو تو اس میں جسم بھی شامل ہو جاتا ہے،یہی نہیں اس کے مطابق ''اصل میں عورت سے تعلق استوار ہوتا ہے تو بیچ میں لچھمن ریکھا بھی ہوتی ہے جو فوراً عبور نہیں ہوئی تو وقت کے ساتھ گہری ہونے لگتی ہے اور عمر بھر قائم رہتی ہے۔یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اس لکیر کو مٹا دینا تھا ورنہ یہ تعلق محض دوستی تک محدود رہتا۔'' یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جس سے ناول نگار آخر تک خود کو الگ نہیں کر پاتا بلکہ اس کو زندگی کا سچ ثابت کرنے کے لئے شعوری کوششیں بھی کرتا ہے۔

ناول میں جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے سارے منظر اپنے آپ صاف اور واضح ہوتے چلے جاتے ہیں،یہاں ناول نگار کی تعریف اس لئے بھی لازم ہے کہ اس نے نہایت ایمانداری اور صاف گوئی سے ساجی کے دل میں روشن اس بے نام رشتے کی نوعیت واضح کردی کہ وہ اس رشتے کو محض دوستی تک محدود رکھنا چاہتی ہے،ورنہ اس کا اپنا یقین تو یہی ہے کہ جسم کے خلوص سے بڑھ کر کوئی خلوص نہیں اور وہ اپنے اس مشن پر ہی آگے بڑھتا ہے حالانکہ وہ کہیں نہ کہیں اس انجانے خوف سے بھی دوچار

ہے کہ ''عمر کے اس حصے میں اس قسم کے تعلقات.....؟بات کبھی تو طشت از بام ہوگی۔نصیب پر کیا اثر ہوگا؟۔

ان سب خوف اور تذبذب کے باوجود ناول نگار ساجی کے جسم کے خلوص کا منتظر ہے،وہ ہر رات اسکا انتظار کرتا ہے مگر کیا عورت اپنا جسم اتنی آسانی سے پیش کر دیتی ہے؟ جتنی آسانی سے مرد خود کو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لئے کے لئے پیش کر دیتا ہے۔ایک رات جب ساجی اس سے ملنے آتی ہے اور یہ شرط رکھتی ہے کہ

''مجھے سیندور لگاؤ''

''سیندور؟؟؟''

میں مسکرایا۔اتنی سی بات؟

''اتنی سی بات......؟تم اسے اتنی سی بات کہتے ہو؟'' وہ تقریباً رو پڑی۔

میں نے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے۔''اے چاند!تو گواہ ہے۔

میں اس عورت کو اپنا تا ہوں.......!اور میں نے چٹکی بھر سیندور اس کی مانگ میں بھر دی۔اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

میں تو دروپدی ہو گئی اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

ناول میں یہاں سے ایک نیا زاویہ روشن ہوتا ہے،ساجی جو ایک کم پڑھی لکھی اور سادہ سی عورت ہے اسے ایک طرح کے تحفظ کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ بقول ناول نگار اپنے جسم کا خلوص دینے کو راضی ہو جاتی ہے اور اب ناول کا مرکزی کردار ساجی میں اپنی بیوی سے الگ ایک نئی عورت دیکھنے لگتا ہے ،ایک ایسی عورت جو مرد کی جنسی تسکین کو نقطۂ عروج تک پہنچا کر خود بھی جنسی تسکین حاصل کرتی ہے،وہ ساجی کے ساتھ اپنی نا آسودہ جنسی خواہشات پوری کرنا چاہتا ہے،وہ سازی کو مکمل طور پر برہنہ دیکھنا چاہتا ہے۔اسکی تمام تر منت وسماجت کے باوجود،اسکے اس اعتراف اور انکشاف کے باوجود کہ وہ برہنہ ہو کر کولڈ ہو جاتی ہے،ناول کا مرکزی کردار اسے برہنہ

www.urduchannel.in

کر کے ہی سیکس کرنے پر آمادہ رہتا ہے، اور اس کے لئے دلائل بھی دیتا رہتا ہے۔

میں نے اسے کپڑوں سے بے نیاز کرنا چاہا۔ وہ مزاحمت کرنے لگی......پلیز مجھے اور عریاں مت کرو۔ میں پوری طرح برہنہ نہیں ہو سکتی......کمار......کمار......مجھے ننگا مت کرو......!

آخر کار ناول نگار ساجی کو یہ اطمینان دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ عورت ہمیشہ اسی طرح ننگی کی گئی ہے۔ اب اسے اپنی بیوی نصیب اور سازی میں ایک واضح فرق نظر آنے لگا تھا، وہ نصیب کے سامنے سگریٹ اور شراب کا شغل نہیں کر سکتا تھا، جبکہ ساجی اسے خود اپنے ہاتھوں سے سگریٹ کیا شراب کے پیالے بنا کر پیش کرنے پر راضی رہتی ہے۔

ناول کا مرکزی خیال عورت اور مرد کے درمیان جسمانی اور جنسی رشتوں کے گرد ہی گھومتا ہے، مگر کیا یہ رشتہ پوری کہانی کے درمیان کبھی جسم سے روح کی طرف بھی سفر کرتا ہے، یہ ایک ایسا سوال ہے جسکا جواب ناول نگار کے اس دعوے کے باوجود بھی نہیں ملتا کہ محبت ہمیشہ روحانی ہوتی ہے۔ جسم وسیلہ ہوتا ہے۔ جسم سے گذرے بغیر کوئی روح تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور کئی بار یہ احساس قوی ہوتا چلا جاتا ہے کہ ساجی اور کمار دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کسی اور ہی ضرورت کے سبب ہم رشتہ ہیں اور اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ جنکا اندازہ ان چند اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ساجی مجھ تک میری محبت میں نہیں پہنچی ہے۔ عدم تحفظ کا احساس اسے میری بانہوں تک کھینچ لایا ہے۔ میری بازوؤں میں وہ محفوظ ہے لیکن کیا میں بھی اسکے پہلو میں محفوظ ہوں؟''......صفحہ ۷

''مجھے درجات سے نفرت ہو رہی تھی، اس شخص کا سینہ ناکام آرزوؤں کا مسکن ہے۔ ایک ناکام آدمی، کہیں سے ساجی مل گئی۔ جو اس کے جھوٹ کو جی رہی ہے اور خود بھی جھوٹ ہو گئی۔ ایک نمبر کی ہائپوکریٹ......پتی......پتی......پتی......اور خود پرائے

مرد سے ہم بستر ہوتی ہے۔''

''میں مسکرایا لیکن خاموش رہا۔ مجھے یاد ہے میں نے ایسا کیا تھا لیکن یہ میری محبت نہیں تھی یہ میری اداکاری تھی میرے دل نے نہیں کہا تھا اسے سینے سے لگا لو۔''

''خود تو میری بانہوں میں عیش کرے گی۔۔ساجی کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ کیا ہوگی......؟ ایک بیوی کسی کی داشتہ ہوگئی......عورت کی تنزلی کی انتہا ہے......!

محبت عورت کو ڈیگریڈ کرتی ہے......؟

میں کیا کروں......؟ عورت کا جسم ایک گرداب ہے، جس میں میں اتر چکا ہوں۔

'' ساجی مجھے دل سے چاہتی ہے لیکن میں اسے دماغ سے چاہتا ہوں''

محولہ بالا اقتباسات سے یہ نتیجہ نکالنا کوئی مشکل نہیں کہ ناول کے مرکزی کردار یعنی ساجی کے کمار کے ذہن میں محبت کا جو تصور ہے وہ روحانی بالکل نہیں، بلکہ وہ جسمانی ضرورتوں اور جنسی ضرورتوں کی تکمیل کا خواہش مند ہے اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا جھکاؤ سازی کی طرف محض نوکری میں اکیلے رہنے کے سبب ہوا ہے یا پھر اس کا تعلق کسی گہری نفسیاتی الجھن سے ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ساجی اور کمار کے درمیان قائم ہوئے رشتے میں شدت اور intimacy ضرور تھی۔ اور یہ رشتہ اس سطح پر تھا کہ ایک دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر اور لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ اس حقیقت سے قطعِ نظر کہ شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان اس طرح کے رشتے بہت دنوں تک برقرار نہیں رہتے اور جسموں کی ضرورت ختم ہوتے ہی جذباتی سطح پر بھی مر جاتے ہیں اور پھر مرد اور عورت دونوں اپنی اصل زندگی میں واپس چلے جاتے ہیں۔

ناول میں ایک نیا اور گمبھیر موڑ اس وقت آیا جب ساجی نے اپنی بیٹیوں کو اچھی تعلیم دینے کی غرض سے پٹنہ شفٹ ہونے کا پروپوزل رکھا اور منطق یہ دی کہ پٹنہ میں رہ کر وہ اپنے کمار سے ہمیشہ مل سکے گی اور اپنی بیٹیوں کو بھی اچھے اسکول میں تعلیم دلا سکے گی۔ ظاہر ہے ساجی کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے بل بوتے پٹنہ میں مکان

www.urduchannel.in

تعلیم اور گھریلو اخراجات کا بوجھ برداشت کر سکے۔لہٰذا یہ سارا بوجھ ناول کے مرکزی کردار کو ہی برداشت کرنا تھا اور یہ سب کچھ understood تھا۔مکان کا انتظام ،بیٹیوں کے داخلے اور گھر کے اخراجات تک بات محدود رہتی تو الگ بات تھی ،ساجی کی شرط اور خواہش یہ تھی کہ اسکا کمار جب بھی پٹنہ آئے تو اپنی بیوی نصیب سے ملنے سے پہلے ایک دو دن اس سے مل کر جائے اور پٹنہ سے لال گنج واپس جاتے ہوئے بھی اس سے ملے۔شروع میں یہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا، پٹنہ آکر پہلے ساجی یعنی اپنی داشتہ کے گھر آنا،گھر میں ضروری سامان مہیا کرنا،ساجی اور بچوں کو گھمانا،انکی ہر ضرورت کا خیال رکھنا......پھر اپنے گھر یعنی نصیب اور اپنے بچوں سے ملنا،ظاہر ہے اب ناول کے مرکزی کردار کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں اور وہ جسم کا خلوص حاصل کرتے کرتے خود دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا،جسکے سبب ذہنی پریشانی ناگزیر تھی۔جسکا اظہار ناول کے آخری حصہ میں کئی بار کیا گیا ہے۔

’’اب ساجی پوری طرح میری دسترس میں تھی تو میں اس کی قربت میں ایک طرح کی الجھن محسوس کر رہا تھا‘‘

’’ساجی میری دسترس میں تھی یا میں اسکے قبضے میں تھا۔‘‘

’’دس دنوں کا راشن خریدا۔اپنے لئے وہسکی لی۔گھر آیا تو ایک نا معلوم سا غصہ میرے اندر دھوئیں کی طرح پھیل رہا تھا گویا سارے کنبے کا بوجھ......؟ مجھے زنجیر صاف نظر آرہی تھی جسکا سرا ساجی کے ہاتھوں میں تھا۔‘‘

ناول نگار کی الجھنیں اور ساجی سے اکتاہٹ کا سبب محض مالی بوجھ نہیں تھا بلکہ اسکے لاشعور میں ایک طرح کا احساسِ شرمندگی بھی تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ نا انصافی کر رہا ہے اور یہ احساسِ جرم ایک ایسی نفسیاتی الجھن تھا جو کمار کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ ’’کیا میں اس عورت سے محبت کرتا ہوں......؟ یا ہمارے درمیان محض سیکس ہے......؟ سیکس نے مرد کو بھی ادھورا رکھا ہے اور عورت کو بھی......ہم دونوں

ادھورے ہیں اور ہمیں ملانے والی کڑی سیکس ہے......شاید ہم کسی اور طرح ایک نہیں ہو سکتے......ہماری روح میں سناٹا ہے۔‘‘

اور حقیقت یہ ہے کہ روح کا سناٹا پرائے جسم کی روشنی سے پرُ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اپنے آپ کو بہت دن تک اس دھوکے میں رکھا جا سکتا ہے کہ روح تک پہنچنے کا راستہ محض جسم سے ہو کر گزرتا ہے۔ساجی جو اس ناول میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے ادھورے پن کو مکمل کرنے کے لئے ایک پرائے مرد کا سہارا لیا۔ساجی کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، مطالعے کا شوق تھا ،اچھی زندگی گزارنے کی خواہش تھی،ایک پڑھے لکھے شوہر کا خواب دیکھا تھا اس نے،مگر یہ سب کچھ وہ اپنی زندگی میں حاصل نہ کر سکی،کمسنی میں اسکی شادی ایک کم پڑھے لکھے اور معمولی آدمی سے ہو گئی،اور پانچ بیٹیوں کی ماں بھی بنی،اپنی تمام تر نا آسودگیوں اور خالی پن کے باوجود اس نے اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر اپنی بیٹیوں کی آنکھوں میں روشن کر دی اور انہیں اچھی تعلیم دلانے کا منصوبہ بنایا جسکے لئے اسے کمار کی صورت میں ایک سہارا مل گیا۔

ناول کا کلائمکس بہت کنونسنگ (convincing) نہیں ہے اور مصنوعی لگتا ہے۔چونکہ ناول کا ہیرو،ساجی سے اکتا چکا ہے،اور دو کشتیوں میں سوار ہونے کے سبب بہت ساری ذہنی پریشانیوں اور نفسیاتی دباؤ کا شکار بھی ہے لہٰذا ساجی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے،جسکے لئے ساجی کے گاؤں میں ایک شادی میں پہاڑی پر اپنی بیوی نصیب، درجات اور دیگر لوگوں کی موجودگی میں ساجی کے ذریعہ تصویریں لینے کے دوران میسمر زم کے ذریعہ suggesion بھیج کر خودکشی پر آمادہ کرنے کا عمل قابلِ ستائش نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ایک طرح کا فرار ہی ہے۔ناول نگار کے میسمر زم کے علم کی اطلاع پورے ناول میں کہیں نہیں دی گئی ہے،خیر یہ ایسا ضروری جز بھی نہیں کہ ناول کی کہانی پر اثر انداز ہو سکے۔اس طرح کے اختتام کو ناول نگار کی مجبوری ہی

www.urduchannel.in

سمجھنا چاہئے ورنہ ناول کو انجام تک پہنچانے کے لئے کئی اور گھماؤ سے گزارنا پڑتا مگر اچھی بات یہ ہے کہ ناول نگار نے ساجی کے شوہر درجات کے سامنے ایمانداری سے یہ قبول بھی کرلیا کہ ''آتم ہتّیا نہیں تھی.......یہ ہتّیا تھی ہتّیا......میں نے اس کی ہتّیا کی احمق آدمی۔ ناول نگار کا یہ اعتراف بھی کم نہیں۔

شموئل احمد کے اس ناول گرداب کا بیانیہ دلچسپ ہے اور قاری کو پورا پڑھنے پر مجبور کرتا ہے، اور اس ناول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کی کڑیاں قاری کو نہیں جوڑنا پڑتیں، بلکہ کہانی اپنے آپ ہی قاری کے ذہن میں سفر کرنے لگتی ہیں۔

☆☆☆

مانک موتی کی تخلیقی اساس

اردو میں مختصر ترین افسانوں یعنی افسانچوں کی روایت بہت پرانی نہیں اور اس صنفِ ادب میں طبع آزمائی کرنے والے تخلیق کاروں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں۔ پھر بھی ان افسانچوں micro stories کی صنفی حیثیت اس لئے بھی مستحکم ہے کیونکہ افسانچوں کو تخلیق کرنے والے فنکاروں میں صفِ اول کے افسانہ نگار شامل ہیں۔

میرے علم کے مطابق افسانچوں کا تخلیقی آغاز سعادت حسن منٹو نے کیا، اسے صنفی حیثیت سے تسلیم کرانے اور پروان چڑھانے کا کام جوگندر پال نے اور اسے سمت و رفتار دینے کا کام رتن سنگھ نے انجام دیا۔ یعنی افسانچوں پر کوئی بھی گفتگو یا بحث ان تینوں افسانہ نگاروں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اپنی کہانیوں اور افسانوں کی طرح منٹو نے اپنے مختصر ترین افسانوں میں بھی اپنا مخصوص اسلوب اور تخلیقی سوچ برقرار رکھی ہے۔ معاشرے کے غلط رسم رواج، فرد اور معاشرے کے درمیان کشمکش، اور کھوکھلی اور فرسودہ تہذیبی قدروں اور روایتوں سے انحراف کا برہنہ اظہار منٹو کے افسانچوں میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک مختصر ترین افسانہ/افسانچہ رعایت ملاحظہ کریں۔

''میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔
چلو اس کی مان لو، کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔''

بظاہر یہ افسانچہ دو بے ربط جملوں پر مشتمل ہے مگر اس میں بھی تقسیم ملک کے بعد رونما ہونے والے فساد اور بربریت کے لکھے گئے منٹو کے کئی افسانوں کا عکس ہے

www.urduchannel.in

،میری جوان بیٹی کو نہ مارو،ایک بوڑھے،نادار اور بے سہارا باپ کی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے،جب کہ ''کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف'' درندگی،ظلم،وحشت اور نفرت کی انتہا کی ایک پوری کہانی بیان کرتا ہے۔

اس کے برعکس جوگندر پال کے افسانچوں کی فضا ان کے افسانوں کے مزاج سے بہت مختلف ہے......ان کے افسانچوں میں زندگی،موت،شعور،لاشعور اور ذات کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے،ان کا افسانچہ سوانحِ حیات ملاحظہ کریں۔

'' میرا جینا ابھی شروع بھی نہیں ہوا پھر بھی میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔'' یا پھر منطق میں وہ اس طرح گویا ہیں'' جب میں پیدا ہوا تو ستاون برس کا تھا،پھر ہر سال میری عمر ایک سال کم ہوتی چلی گئی اور اس طرح آج میں نے اپنے ستاون برس پورے کر لئے،آج کے بعد میں جتنا بھی جیوں گا اپنی عمر سے اوپر جیوں گا۔''

محولہ بالا دونوں افسانچوں میں زندگی اور موت کا فلسفہ فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے،ان کے افسانچوں کی فضا بہت گمبھیر ہوتی ہے،ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ قاری کو بھی اپنے تخلیقی عمل میں شریک کر لیتے ہیں۔

رتن سنگھ کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہمراہ نہایت خصوصیت سے کیا جاتا ہے، ''مانک موتی'' ان کے ایک سو ایک افسانچوں پر مشتمل کتاب ہے جسے افسانچوں کے سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے،یوں تو رتن سنگھ کے با قاعدہ افسانے بھی مختصر ہی ہوتے ہیں مگر ان کے افسانچوں میں یہ اختصار کمالِ ارتکاز کو پہنچ گیا ہے۔مجھے نہیں معلوم کہ ادب میں اس صنف کا مستقبل کیا ہوگا،آیا یہ بھی آزاد غزل کی طرح چند تخلیق کاروں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گی،یا پھر یہ صنف دیر تک ہمارے افسانہ نگاروں کی تخلیقی ترجیہات کا حصہ رہے گی۔مگر افسانچوں کی تخلیق کے جواز میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ کمپیوٹر عہد کی تیز رفتار زندگی

میں انسان ایک مشین میں تبدیل ہو گیا ہے اور مشین محض چند بندھے ٹکے اصولوں پر کام کرتی ہے اور اس نے انسان سے آسائشوں اور آسودگیوں کی قیمت پر اس کا وقت خرید لیا ہے۔بڑے شہروں میں ہر طبقہ کا انسان وقت کی قلت کا شکار ہے،اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے گھنٹوں بسوں اور ٹرینوں کا سفر،بھاگ دوڑ،دفتر،شام،گھر،بچے،نیند اور خواب میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔لہٰذا آج کے انسان کے پاس طویل فن پاروں کو پڑھنے کے لئے وقت نہیں ہے،ایسے میں مختصر ترین فن پاروں کی اہمیت اور افادیت ناگزیر ہے۔

رتن سنگھ کے افسانچے بڑے کینوس پر پینٹ کی گئی مائکرو سائز کی تصویریں ہیں، جنہیں سمجھنے کے لئے magnifying glass کی ضرورت ہے،ان کے یہاں سیاسی،سماجی اور نفسیاتی کشمکش،انسانی جبلت اور عالمی مسائل ومصائب کا اظہار نہایت خوبصورتی سے ہوا ہے۔مانک موتی کا پہلا افسانچہ ملاحظہ کریں۔

'' ریس کورس میں گھوڑے دوڑ رہے تھے اور سانسیں آدمیوں کی اکھڑ رہی تھی۔''

یہ افسانچہ بظاہر ایک ہی جملے پر مشتمل ہے مگر اس کے باطن میں گمبھیر انسانی نفسیات پوشیدہ ہے،جو انسان کی فطری لالچ اور بے جا خواہش کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوا ہے۔

مانک موتی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کمزور ہوتے رشتوں،بے اعتدالی، زوال پزیر تہذیبی قدروں،انسان کی شکست و ریخت،نفرت،تعصب،تشکیک اور سیاسی تحفظات،فلسفۂ حیات وموت اور موجودہ عہد کے انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور اس کی باریکیوں پر کئی کہانیاں موجود ہیں،جو ان کے عصری شعور وآگہی کا پتہ دیتے ہیں۔مانک موتی میں شامل تیسری کہانی ملاحظہ کریں۔

''ایک چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے محلے کی ایک تنگ سی گلی میں چھوٹی سی بات پر دو فرقوں کے درمیان فساد ہو گیا۔آگ ایسی لگی،اتنی پھیلی کہ ایک بڑا ملک تباہ ہو گیا۔'' کہانی نمبر ۲۱ میں رتن سنگھ نے موجودہ سیاسی سباق وسیاق میں زندگی گزارتے

www.urduchannel.in

عام سے انسان کے دکھ کو یوں بیان کیا ہے۔

''ایک نیتا لوگوں کے دکھ درد کا حال جاننے کے لئے گاؤں کے لوگوں سے مل رہے تھے۔ کہیے آپ کو کیا پریشانی ہے؟ انہوں نے ایک مسکین آدمی سے پوچھا۔ آپ کے آوے سے مہاراج ہمار دہاڑی ٹوٹ جات ہے اور پھر ایک وکھت (وقت) کھائے کا نہیں ملتا۔ نیتا جی اپنا سا منھ لے کر بڑھ گئے۔''

کہانی نمبر ۳۲ میں انسانی فطرت اور نفسیات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''جس ساڑی کو پہنے ہوئے وہ آدی واسی عورت نہا رہی تھی، وہی ساڑی نہانے کے بعد اسے پہننی بھی تھی، اس لئے اس کا کبھی کوئی انگ ننگا ہو جاتا اور کبھی کوئی۔ برآمدے میں بیٹھ کر یہ سب دیکھتے ہوئے میری بیوی نے مجھے ٹوکا۔ اس طرح کھلے میں نہانا، اس آدی واسی عورت کی مجبوری ہے مگر آپ ......اور مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے جھوٹی شرافت کے بنے ہوئے سارے کپڑے میرے تن سے اتار کر مجھے سرِ عام ننگا کر دیا ہو۔''

موت وحیات کے فلسفے اور زندگی کی سچائیوں پر مشتمل ایک کہانی جو مانک موتی میں شامل ہے، کچھ یوں ہے

''صبح جب گھر سے باہر نکلا تو اس کا جوان سایہ زندگی کی روشنی بن کر اس کے آگے آگے چل رہا تھا، شام کو جب وہ تھکا ہارا لوٹا تو اس کا بوڑھا سایہ گھسٹتا ہوا اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔''

ایک اور کہانی......

''جب میں خیمہ گاڑ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جو میرا باپ سا لگتا تھا، اپنا خیمہ اکھاڑ رہا تھا۔ اور جب میں کوچ کی تیاریاں کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک لڑکا جو میرے بیٹے سا لگتا تھا، اپنا خیمہ اتنی مضبوتی سے گاڑ رہا تھا، جیسے

وہ یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہو۔''

ایک اور کہانی......

''ماں کے پیٹ میں بچہ الٹا ہوا تھا، لیکن پھر بھی اس کے دن بڑے آرام سے گزر رہے تھے، پیدا ہوتے ہی اس نے ماں کے کراہنے کی آواز سنی۔ تو وہ سمجھ گیا کہ یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے، اس لئے اس نے رونا شروع کر دیا۔''

محولہ بالا کہانیوں میں رتن سنگھ کی متنوع سوچ اور مشاہدے کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حیات وموت اور آواگمن کا تصور، اس کے علاوہ حیاتِ انسانی کے تسلسل اور مستقبل کی خوش آئند بشارتوں کو بھی ان کہانیوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مانک موتی کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ رتن سنگھ نے اپنی ان کہانیوں میں اپنی زندگی کے طویل تجربوں کو پیش کر دیا ہے۔ اور ان کی کہانیوں کا اختتام یا کلائمکس مختصر آزاد نظموں کی طرح ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں کہانی ختم ہونے کے باوجود بھی ذہن کے پردے پر چلتی رہتی ہے۔ انہیں کہانی بننے اور کہنے کا فن بخوبی آتا ہے۔ کبھی ان کی کہانیاں سیدھے سادے بیانیہ اسلوب میں بیان ہوتی ہیں، کبھی وہ کہانی کی ترسیل میں علامت اور استعارے کا سہارا لیتے ہیں، تو کبھی ان کی کہانیوں میں داستانوی فضا قائم رہتی ہے، اس کے علاوہ کبھی وہ اپنے افسانچوں کا آغاز دادیوں اور نانیوں کی طرح کرتے ہیں، مثلاً پرانی بات ہے، بڑے دنوں کی بات ہے یا پھر کیا دیکھتا ہوں وغیرہ جملے ان کی کہانیوں میں ضرور ہوتے ہیں۔

رتن سنگھ اپنے طویل قیامِ جبل پور کے دوران وظیفہ یاب ہونے کے بعد ایک عرصہ تک صحافت سے بھی وابستہ رہے، اور ایک بڑے گروپ کے اخبار میں مدیر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ لہٰذا ان کی کہانیوں کے باطن میں سیاسی اور سماجی شعور و آگہی کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کہانی میں تعصب، طبقاتی کشمکش اور سماجی عدم مساوات وغیرہ کی شمولیت ناگزیر ہے۔ اس

www.urduchannel.in

حوالے سے مانک موتی میں صفحہ ۴۷ پر ایک کہانی ہے جو کسی بھی حساس قاری کو جھنجھوڑ سکتی ہے۔اس کہانی میں ماسٹر کلاس روم میں بچوں کو ایک کہانی سناتا ہے، جو سرکار کی انصاف پسندی، انتظامیہ کی مستعدی اور عوام کی سیاسی اور سماجی بیداری کی خوبصورت مثال ہے۔ یہ کہانی ایک ٹیچر بچوں کو سناتا ہے، ٹیچر جو نئی نسل کا معمار ہے، بچے جو مستقبل کے ذمہ دار شہری ہیں، کلاس روم جو تہذیبی اور ثقافتی درس گاہ ہے، یعنی ہر لحاظ سے یہ کہانی ایک آدرش ہے، مگر کہانی ختم ہوتے ہی ایک بچہ ٹیچر سے سول کرتا ہے۔ جناب آپ نے جو کہانی سنائی ہے وہ بہت اچھی ہے، میں بھی ایسا ہی شہری بننا چاہتا ہوں، بس ایک سوال پوچھنا تھا۔' وہ ۱۹۸۴ء میں......''

بچے کا یہ سوال سن کر ٹیچر فوراً گھنٹی بجا کر پیریڈ کے اختتام کا اعلان کر دیتا ہے۔تھوڑی دیر کے لئے ہم اس کہانی کو ماضیٔ قریب کے ایک انسانیت سوز واقعے سے منسلک کر کے دیکھیں اور یہ سوال خود سے کریں، تو کیا ہم واقعی کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں گے۔کیا یہ سچ نہیں کہ ہم ابھی تک اپنے ذہنی تعصّبات اور تحفظات اور طبقاتی کشمکش اور نفرت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے ہیں؟ کیا آدرش، تہذیب اور مساوات کی روشن تعلیمات محض کاغذ کی زینت نہیں ہیں؟ رتن سنگھ کے یہاں عالمی سیاسی بصیرت اور عالمی عصری شعور وآگہی کا اندازہ اس کہانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

''ایوان کے اندر دو دھڑوں کے درمیان جنگ کو ختم کر کے امن قائم کرنے کی بات چل رہی تھی اور ایوان کی چھت پر لہرا رہے دونوں دھڑوں کے جھنڈے ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہوئے آپس میں زور زور سے ٹکرا رہے تھے۔''

ایک کہانی اور ملاحظہ کریں۔

''برلن کی دیوار ٹوٹنے پر مشرقی جرمنی میں رہ رہا ایک ہندوستانی مغربی جرمنی میں رہ رہے پاکستانی سے اس جوش سے بغل گیر ہوا، جیسے ان کے اپنے ملکوں کو تقسیم کرنے والی دیوار ٹوٹ گئی ہو۔''

ان دونوں افسانچوں میں محبت، بھائی چارگی اور امن واخوت کا عالمی پیغام مضمر ہے۔مجموعی طور پر رتن سنگھ کے افسانچے زندگی کے وسیع کینوس پر پینٹ کی گئی ایسی تصویریں ہیں، جن میں ہم اپنے احساس وادراک کی آنکھ سے معاشرے کی موجودہ تہذیبی، سیاسی اور سماجی صورتِ حال کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔اس کے برعکس مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ رتن سنگھ کے افسانچے مختصر ترین کہانیوں کے سفر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جو نئی نسل کو راستہ دکھانے میں کامیاب ہیں۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

لے سانس بھی آہستہ......ایک مطالعہ

مشرف عالم ذوقی موجودہ عہد کے بے حد بیباک versatile اور تیز رفتار تخلیق کار ہیں وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، نقاد اور سیاسی اور سماجی مبصر ہیں، اس کے علاوہ ان کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں اپنے اردگرد ہونے والے سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی سطح پر والے تغیرات اور واقعات پر اپنی بے باک رائے کے اظہار کی جرأت مندی ہے۔ وہ حکومت کی پالیسیوں اور منصوبوں پر بھی اپنی بے باک اور براہِ راست رائے کے اظہار میں پیش پیش رہتے ہیں۔ وہ ادب میں عصری سیاسی اور سماجی شعور و آگہی کے قائل ہیں، ان کے مطابق ادب میں احتجاج لازم ہے۔ اور یہ احتجاج مذہب کے لئے بھی، بے راہ روسیاست کے لئے بھی، نیوکلیائی تجربوں کے لئے بھی اور سارے عالم میں اشانتی کے لئے بھی ہونا چاہئے۔ مگر افسوس ہے کہ موجودہ مشینی عہد میں ہمارے بیشتر تخلیق کاروں کے یہاں احتجاج کا یہ جذبہ سو چکا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو مشرف عالم ذوقی ادب میں relevance، مقصدیت اور صداقت کے طرفدار ہیں۔

مشرف عالم ذوقی نے بہت سارے افسانوں کے علاوہ کئی عمدہ ناول بھی تخلیق کئے ہیں، جن کے موضوعات موجودہ عہد کی سیاسی اور سماجی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے مطابق اگر آج کا فنکار اپنے موضوعات کا انتخاب سیاسی اور سماجی سطح پر گہرے فکر و شعور کے ساتھ نہیں کرتا ہے تو وہ بڑا ادب تخلیق ہی نہیں کر سکتا، اور یہ فکر ان

کے زیادہ تر ناولوں میں دیکھنے کو ملتی ہے، مثال کے طور پر اپنے اولین ناول ''عقاب کی آنکھیں'' اور ''پوکے مان کی دنیا'' میں ذوقی نے بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سائبر اور انٹرنیٹ عہد کے بچے جو جنک فوڈ کھاتے ہیں اور ماں باپ کی نظریں بچا کر پورن سائٹ دیکھتے ہیں اور پھر ایک دن کسی جرم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا ناول ''بیان'' جسے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، یہ ناول بابری مسجد کے المیہ اور اس کے بعد رونما ہونے والے فساد اور بے یقینی کی فضا پر مبنی ہے۔ ''آتشِ رفتہ کا سراغ'' مشرف عالم ذوقی کا تخلیق کردہ ایک ضخیم ناول ہے جو آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتِ حال کی زبوں حالی پر تحریر کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کو اپنی مرضی سے اپنا وطن منتخب کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک، ناانصافی اور ان پر شک و شبہات کرنے والی ذہنیت کو ذوقی نے نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے، جسے ادب کے سنجیدہ قارئین نے بے حد پسند کیا ہے۔

زیرِ نظر ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' کا مرکزی خیال بھی ان کے عصری، سماجی اور سیاسی شعور و آگہی کا آئینہ دار ہے۔ اس ناول میں ہندوستان کی آزادی کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال اور تہذیبوں کے تصادم اور نسلوں کے ٹکراؤ اور اخلاقیات سے انحراف کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ذوقی کے مطابق یہ ناول تہذیب کا مرثیہ نہیں بلکہ گلوبل سماج کی بدلتی ہوئی تصویر کا آئینہ ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی زبان سادہ، لہجہ براہِ راست مگر اندازِ بیان اور اسلوب متاثر کن ہے اور موضوع بالکل relevant ہے، اور یہی خوبی ہے کہ ان کے ناولوں کو نہ صرف سنجیدگی سے پڑھا جاتا ہے بلکہ ان پر مباحث اور رد عمل بھی ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' کی کہانی یوں تو تقسیمِ ہند کے بعد

www.urduchannel.in

مسلمانوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی معاشی اور معاشرتی زبوں حالی کو بیان کرتی ہے مگر اس کے ساتھ برسوں بلکہ صدیوں کی تہذیبی اور خاندانی روایات اور اخلاقیات کا سفر بھی جاری رہتا ہے، اس کہانی کا مرکزی کردار عبدالرحمن کاردار ہے، جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو گیارہ بجے اس عالمِ رنگ و بو میں نمودار ہوتا ہے، یعنی حصولِ آزادی سے محض ایک گھنٹہ قبل۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ناول نگار نے اپنے مرکزی کردار کی پیدائش کو غلام ہندوستان میں اور اس کی پرورش، تربیت اور زندگی کے سفر کو آزاد ہندوستان میں دانستہ طور پر دکھایا ہے یا پھر یہ غیر شعوری طور پر کہانی کا لازمی حصہ بن گئے۔ اس کا جواب تو کہانی میں آگے ملتا ہے، مگر عبدالرحمن کاردار اپنی کمسنی سے ہی کہانی کا ایک بے حد ضروری اور ناقابلِ فراموش مرکزی کردار بن جاتا ہے۔ اس ناول میں بنیادی طور پر نہ صرف تہذیبوں کے تصادم بلکہ نسلوں کے تصادم اور جنریشن گیپ کے نتیجے میں نئی کانسل کا اپنی پیش رو نسل سے بغاوت اور صدیوں پرانی اخلاقی اور مذہبی روایات کو بھی نہایت خوبصورتی سے تحریر کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک آزادی سے ایک گھنٹہ قبل عبدالرحمن کاردار کی پیدائش کو رکھنے کا جواز بھی یہیں سے فراہم کیا جاسکتا ہے۔

تہذیبوں کے تصادم اور اسکے نتائج کی تفہیم کے لئے ناول میں پروفیسر نیلے کے کردار کو تراشا گیا ہے۔ پروفیسر نیلے کے مطابق

”تہذیبیں جانوروں سے زیادہ نوکیلے دانتوں سے ہمیں زخمی کرجاتی ہیں ......ایک تہذیب ۴۷ کے پہلے کی تھی۔ ایک غلام تہذیب ۴۷ کی صبح نمودار ہوتے ہی ہم ایک نئی تہذیب کی دوسری سرنگ میں داخل ہوگئے۔

اس ناول میں تہذیبوں کے تصادم کے علاوہ ایک اور سوال تیزی سے گردش کرتا ہے وہ یہ کہ آخر جائز اور ناجائز کی تشریحات کیا ہیں؟ کیا جو ہم سوچتے ہیں وہی سچ ہے؟ یعنی ہمارا مذہب......ہماری تہذیب......اور ہمارا لباس......؟ اس سوال کا جواب اتنا

آسان بھی نہیں۔ دو عورتیں ہیں، دونوں بچے پیدا کرتی ہیں......ایک شادی شدہ ہے تو بچہ جائز......دوسری غیر شادی شدہ ہے تو بچہ ناجائز......؟ یعنی مذہب کی اخلاقیات ہی سب سے بڑا سچ ہے......

کہانی بلند شہر میں اپنا وجود تلاش کرتی ہے، جہاں دو حویلیاں ہیں، انگریزوں کے زمانے کی ہیں اور مکینوں کی شان و شوکت اور خاندانی عظمت کی علامتیں......حویلی کے مکینوں کے شاندار ماضی اور خاندانی شرافت کی گواہ۔ آزادی کے بعد کی بے یقینی اور مشکوک فضا میں چھوٹے موٹے فسادات کے باوجود دونوں فرقوں کے لوگ آپس میں سکون سے زندگی کررہے تھے اور آزادی کے بعد بھی کافی دنوں تک کوئی بھی یہاں سے وہاں آجاسکتا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

”اس زمانے میں ہندوستان اور پاکستان کو لے کر اتنی مشکلات نہیں تھیں۔ اکثر یہاں کے لوگ پاکستان جا کر بس جایا کرتے تھے، پاکستان سے کچھ لوگ ہندوستان آئے، پھر واپس نہیں گئے یہ سلسلہ آزادی کے بعد بھی بہت دنوں تک چلتا رہا۔“

اسی طرح عبدالرحمن کاردار کے ماموں سفیان بھی پاکستان چلے گئے تھے مگر بیوی کے انتقال کے بعد اپنی بچی نادرہ کے ساتھ واپس بلند حویلی واپس لوٹ آئے تھے۔ ان سب کے درمیان حویلیوں کی شان و شوکت اور جاگیرداری ختم ہو رہی تھی اور مکینوں کے لئے معاشی پریشانیوں کا دور شروع ہو چکا تھا، جو شاید انگریزی دورِ حکومت میں نہیں تھا، اب حویلیوں کے مکینوں کے سامنے survival کا مسئلہ سب سے بڑا تھا۔ بدلتی ہوئی تہذیب اور بدلتے ہوئے ماحول میں جو لوگ جہاں دیدہ اور دور اندیش تھے انہوں نے اپنی حویلیاں فروخت کر کے اپنے چھوٹے موٹے کام بھی شروع کردیے تھے، مگر جن لوگوں کو خاندانی شرافت اور عظمت کا پاس و لحاظ تھا ان کے نزدیک حویلیوں کو فروخت کرنا اپنے بزرگوں کی روحوں کو ایذا پہنچانے کے برابر تھا۔ حالانکہ ان مکینوں میں برسوں سے حویلیوں کو رنگ و روغن کرانے کی استطاعت بھی نہ رہی تھی اور حویلیاں

www.urduchannel.in

مسلم تہذیب کی طرح خستہ حال اور اپنے شاندار ماضی پر نوحہ کناں تھیں۔

''لے سانس بھی آہستہ'' میں جن دو حویلیوں کو کہانی میں بیان کیا گیا ہے ان میں ایک نظر محمد کی تھی دوسری بلند حویلی وسیع الرحمن کا کردار یعنی عبدالرحمن کا کردار کے والد کی تھی۔ کہانی کے مطابق نظر محمد کی بیوی پر جنات سوار تھا جس کا علاج مولوی محفوظ اپنے عمل اور جھاڑ پھونک سے کر رہے تھے، جس پر بلند حویلی کے مکینوں کا کوئی عقیدہ نہ تھا بلکہ وہ اسے توہمات سے تعبیر کرتے تھے مگر جب ایک دن مولوی محفوظ بلند حویلی کے مکینوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ بلند حویلی میں گمشدہ خزانہ دفن ہے تو وسیع الرحمن کے دل میں زندگی کرنے کی ایک نئی امید روشن ہو گئی، انہیں یقین ہو گیا کہ خزانہ برآمد ہونے کے بعد ان کے اچھے دن شروع ہو جائیں گے مگر جب کھدائی کے بعد کوئی خزانہ برآمد نہیں ہوا، بلکہ کسی کی شکایت پر حویلی میں پولس آئی تو مانو جیسے وسیع الرحمن کا کردار کی عزت اور خاندانی شرافت مجروح ہو گئی اور اس کا اثر ان کے ذہن و دل پر اسقدر ہوا کہ وہ شدید طور پر بیمار ہو گئے اور یہیں سے شروع ہوتا ہے کہانی کا ٹرننگ پوائنٹ، جس کے نتیجے میں عبدالرحمن کا کردار کی ماں جو ہمیشہ پردے میں رہی اور اس نے کسی غیر محرم کی صورت بھی نہ دیکھی تھی، اچانک اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر نقاب سے بے پروا کوتوالی پہنچ کر انسپکٹر بانکے بہاری کی خوب خبر لیتی ہے۔

حویلی میں برسوں سے اپنی مرضی سے قید ایک عورت کا اس طرح کوتوالی جانا دراصل ایک علامت ہے تبدیلی کی، تہذیب کے نئے سفر کی، سماجی اخلاقیات کی نئی شروعات کی، روایات اور قدروں کے ٹوٹنے کی، اور نئی قدروں کے جنم لینے کی، جس کا گواہ عبدالرحمن کا کردار بنا اور اس نے بھی بالآخر خود کو نہ صرف نئی قدروں سے ہم آغوش کیا بلکہ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرے میں اپنے وجود کو بچانے کے لئے نئی قدریں بھی مرتب کیں۔ کہانی کا ایک اور بے حد اہم کردار نور محمد ہے جو بچپن سے ہی عبدالرحمن کا کردار کا دوست ہے اور کہانی کے ساتھ متواتر سفر کرتا ہے، جس کے بغیر

کہانی ادھوری ہی رہے گی۔ نور محمد کی شادی، عبدالرحمٰن کا کردار کے ماموں سفیان کی بیٹی نادرہ سے ہو جاتی ہے جو نگار کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی فوت ہو جاتی ہے۔ نور محمد کی بیٹی نگار ایک عجیب سی بیماری کا شکار ہو کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے اور اکثر اوقات ابنارمل حرکتیں کرتی ہے یہاں تک کہ لباس سے بے نیاز بھی ہو جاتی ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناول میں حالات و واقعات بہت تیزی سے بدلتے ہیں یعنی ان کی کہانی کا سفر اس تیز رفتاری سے ہوتا ہے کہ اگر قاری کہیں سست پڑ جائے تو کہانی سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں کہانی کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، مثلاً کہانی جس عہد میں سفر کرتی ہے اس میں رونما ہونے والے تاریخی اور سیاسی واقعات بھی کہانی کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آزادی کے بعد رونما ہونے والا سب سے بڑا سیاسی واقعہ یعنی سقوطِ بنگلہ دیش اور عالمی دہشت گردی کے نتیجے میں ۹/۱۱ کو twin tower پر ہونے والے حملے بھی غیر شعوری/شعوری طور پر ناول کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بابری مسجد کے تنازعے کے بعد نکلنے والی رتھ یاترا اور اس کی شہادت کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات کی زہرافشانی کا ذکر بھی کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے، جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ذوقی کا مطالعہ بے حد وسیع اور گلوبل ہے اور دوسرے وہ اپنے گرد و پیش ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا گہرا شعور و ادراک رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ ذوقی کی کہانی نویسی کی ایک اور انفرادیت یہ ہے کہ ان کے یہاں جنس کی نفسیات اور اس کے محرکات کے مطالعے کا بھی احساس ہوتا ہے، ان کی کئی کہانیوں میں مجھے جنس کی نفسیات کے افہام و تفہیم کا عمل محسوس ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ فرائڈ کے فلسفۂ جنس اور تحلیلِ نفسی کے فلسفے سے کتنا متاثر ہیں مگر یہ بات سچ ہے کہ ان کی کئی کہانیوں میں تحلیلِ نفسی اور انسانی جبلت کے فکری اور فطری عناصر کی آمیزش کا احساس ہوتا ہے۔ اس ناول میں بھی ان کے یہاں family incest کا

www.urduchannel.in

تجربہ ملتا ہے، حالانکہ یہ مغرب میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے مگر مشرق میں family incest اب بھی ناقابل قبول ہے اور گناہ تصور کیا جاتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ علت کسی نہ کسی حد تک ہمارے معاشرے کا بھی حصہ ہے۔ زیرِ نظر ناول میں بھی اس نفسیاتی الجھن کو ذوقی نے نہایت تخلیقی ہنرمندی سے پیش کیا ہے، جس کی گرہیں پروفیسر نیلے نے کھولیں۔

نور محمد کی بیٹی نگار جو اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے، اپنی ماں نادرہ کی بے وقت موت کے بعد جنسی خواہشات سے عاری اپنی بے رنگ آنکھوں اور بے طلب جسم کے ساتھ اپنے والد کی ریکھ دیکھ میں اپنی کم سنی کی حدوں کو لانگھ رہی ہے، جس کو نہلانے، دھلانے کے ساتھ اس کے دیگر سارے کام بھی نور محمد ہی کرتا ہے، پھر ایک دن نور محمد کا ایک دور کا رشتہ دار ان کے گھر آ کر ٹھہرتا ہے اور پھر اس کے قیام کے دوران نگار لذتِ کام و دہن سے آشنا ہو جاتی ہے اور پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک اور رنگ نظر آنے لگتا ہے جسے نور محمد واضح طور پر محسوس کرتا ہے اور اس کا ذکر عبدالرحمٰن کاردار سے بھی کرتا ہے، مگر ایک دن پھر رات کے کسی حصہ میں نگار، نور محمد سے ہی اپنی جنسی تسکین حاصل کرتی ہے، جس کے نتیجے میں نور محمد بھی نگار کے ساتھ مسلسل جنسی لذت حاصل کرنے لگتا ہے اور پھر ایک دن نگار حاملہ ہو جاتی ہے، پھر نگار شرمندگی کے سبب اپنی شہر کی حویلی فروخت کر کے ایک گمنام سے گاؤں میں رہائش پزیر ہو جاتا ہے۔ نور محمد اپنے اس عمل پر شرمندہ تو ہوتا ہے مگر اپنی جنسی اور جبلی خواہشات کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور خودکشی کی شدید خواہش کے باوجود نگار کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہنے لگتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ نگار اس کے بعد نارمل حالات کی طرف بھی لوٹنے لگتی ہے مگر وہ بھی ایک بیٹی جینی کو جنم دے کر جلد ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیتی ہے۔

نور محمد کی زندگی میں اتنی تیزی سے اتنے بھیانک بدلاؤ ہوتے ہیں کہ کہانی کا پہیہ بہت تیز رفتاری سے گھوم جاتا ہے۔ دراصل مشرف عالم ذوقی اپنے اس ناول کے

ذریعہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تہذیبوں کے تصادم میں مذہبی اخلاقیات اور قدروں کے پیمانے بہت تیزی سے مغرب کی طرف بھاگتے ہیں اور پھر جائز اور ناجائز کی تشریح اور تفریق مشکل ہو جاتی ہے۔ نور محمد جو ناول میں ایک بے حد مہذب اور اخلاقیات کے آدرش کے طور پر سامنے آتا ہے آخر کار اپنی تہذیب اور اخلاقیات کی جڑوں کو خود ہی مسمار کر دیتا ہے، اور شاید اسی لئے مشرف عالم زوقی یہ کہنے کو مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہے یہاں لمحہ ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے۔

زیرِ نظر ناول کا شمار ایک کامیاب ناول کے طور پر کیا جائے گا کیوں کہ اس میں کہانی کا سفر بیک وقت کئی سطحوں اور متعدد دشاؤں میں ہوتا ہے اور خاص بات یہ ہے کی ذوقی کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ بھی رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ اچھے ناول کو پڑھنے کا تجربہ زندگی سے روبرو ہونے کا تجربہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ہم اپنے گرد و پیش کے اندھیروں کو دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اتنے عمدہ ناول کے لئے مشرف عالم ذوقی قابلِ مبارک باد ہیں۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

وحشی سعید کے افسانوں میں زندگی کی تلاش

(سڑک جارہی ہے کے حوالے سے)

میرے نزدیک، تقریباً ایک صدی کے اپنے طویل سفر کے بعد اردو افسانہ ایک نئے تخلیقی پڑاؤ پر نظر آتا ہے۔ روایتی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید جیسے لاحقوں سے آزاد اردو افسانہ قاری اور انسانی زندگی سے مکالمہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ متعدد سماجی، سیاسی، تخلیقی اور ذاتی تجربات سے گزر کر اردو افسانہ نسبتاً ٹھہراؤ کا حامل ہو گیا ہے اور بیانیہ کی طرف واپسی کے سبب قاری سے اپنا رشتہ از سرِ نو قائم کرنے میں کامیاب بھی۔

موضوعات کی سطح پر بھی سیاسی، سماجی، معاشی سروکار اور تہذیبی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والی سیاسی اور دیگر تبدیلیوں کو بھی اپنے موضوعات کا حصہ بنانے میں نیا افسانہ کامیاب رہا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جدیدیت کے نام پر لکھے جانے والے مبہم، پیچیدہ اور ترسیل کے المیہ کا شکار افسانے بعض ناقدین کی کوششوں کے باوجود افہام و تفہیم سے عاری ہی رہے ہیں مگر بیانیہ کی طرف واپسی کے بعد اردو افسانہ اور قاری کے درمیان رابطہ بحال کرنے میں کشمیر کے جن افسانہ نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے ان میں وحشی سعید کا نام بیحد نمایاں ہے۔

وحشی سعید کے افسانوی مجموعہ ''سڑک جارہی ہے'' کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے

مجھے بار بار یہ احساس ہوا ہے کہ انکے افسانوں میں زیریں لہر کے طور پر ایک طرح کا استعاراتی اور علاماتی نظام کارفرما ہے جو انکے افسانوں کی معنویت میں اضافہ تو کرتا ہے مگر انہیں ترسیل کے المیے کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ یہ خصوصیت اس لئے بھی اہم ٹھہرتی ہے کہ ان کے یہاں بیانیہ کے نام پر سپاٹ، کھردرے اور اکہرے پن کا احساس نہیں ہوتا بلکہ انکے یہاں افسانوں میں کئی سطحوں پر معنویت کا احساس ہوتا ہے جس سے افہام و تفہیم کی نئی پرتیں کھلتی ہیں۔

وحشی سعید کے افسانوی مجموعے ''سڑک جارہی ہے'' میں تیں افسانے شامل ہیں۔ اور خاص بات یہ ہے کے ان کے بعض افسانے مختصر ہوتے ہوئے بھی اپنے موضوعات، تکنیک، کرافٹ اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے بڑے کینوس پر بنائی ہوئی ایسی پینٹنگ کی طرح ہیں جو عام انسان کی زندگی کے مسائل و مصائب اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کو مصور کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ افسانے عام قاری سے رشتہ استوار کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور افسانہ نگار کی تخلیقی توانائی اور اسلوب کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔

زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ''سائے کی لاش'' ہے۔ جو زندگی سے بھرپور ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک مصوّر ہے جو ایک بھرپور زندگی جینے کا خواہش مند ہے اور کینوس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کے ورق پر بھی خوبصورت تصویریں بناتا ہے مگر ایک ایک کر کے یہ ساری زندہ و جاوید تصویریں اسکی زندگی سے بچھڑتی چلی جاتی ہیں۔ اور جب تصویروں کی ایک نمائش میں ایک خوبصورت چہرہ اسکی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور وہ اسکی مکمل اور خوبصورت تصویر بنانے کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے تو نگار اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ تب اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ وہ پچاس سال کی عمر پر پہنچ گیا ہے اور اب دوسروں کے لئے اسکی زندگی میں کچھ نہیں بچا ہے۔ اس افسانے میں خوابوں کو مسلسل تعبیر کرنے والے مصوّر کے یہاں

www.urduchannel.in

تصویریں زندگی سے محبت کا استعارہ ہیں اور قاری کو آخر تک باندھے رکھتی ہیں اور انتم سانس تک زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا افسانہ ''جمود کا جنازہ'' ہے جو اپنے پلاٹ کے اعتبار سے بے حد نازک ہے۔جمود کا جنازہ دراصل ہمارے معاشرے میں انسانی رشتوں کی شکست و ریخت ان کی ارزانی اور تہذیبی قدروں کے زوال کا اعلامیہ ہے۔ یہ افسانہ یوں تو خاصا مختصر ہے مگر قاری کے ذہن ودل پر دیرپا اثرات مرتب کرتا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار جمال جسکی زندگی جمود کا شکار ہے اسکی زندگی میں قریبی رشتوں کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے، وہ یتیم ہے اور پھر ایک دن اسکے دل میں یہ جذبہ جنم لیتا ہے کہ کاش اسکی بھی کوئی بہن ہوتی ۔اسکی یہ خواہش پوری بھی ہوجاتی ہے اور اسکی زندگی میں شبنم داخل ہوتی ہے جو خود اسکی طرح یتیم ہے اور فٹ پاتھ پر ملی تھی اسے۔ جمال کی زندگی کا خلا پر ہوجاتا ہے اور وہ بہن جیسے پاکیزہ رشتے کی پرورش اور پرداخت میں مصروف ہو جاتا ہے۔حالانکہ دنیا اس رشتے کی پاکیزگی اور معصومیت کو قبول نہیں کرتی بلکہ سچائی جانے بغیر اس میں گناہ اور گندگی کا الزام دھرتی ہے۔ جمال ان سب الزامات کی پرواہ کئے بغیر اپنی منھ بولی بہن کے ساتھ مسرور نظر آتا۔

جوان ہوتی اس بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر بھی ہوتی ہے اسے اور جب اپنی بہن کے لئے رشتہ تلاش کر کے وہ ایک دن شبنم سے کہتا ہے کہ اب وہ ایک دوسرے سے دور ہورہے ہیں کیونکہ لڑکیاں تو پرائی ہی ہوتی ہیں۔ مگر شبنم کے غیر متوقع جواب اور ردِ عمل میں اس نے جو سنا اس نے ایک بار پھر جمال کی زندگی پر جمود طاری کر دیا۔ شبنم کا یہ جملہ کہ ''تم ہی میرے جسم وروح کے مالک ہو۔میرے خوابوں کے شہزادے ہو......کیوں نہ ہم دونوں شادی کرلیں۔'' یہ سن کر جمال ایک مجسمے کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔اور رشتوں کی بے ثباتی اور بے یقینی کے درمیان اس نے شبنم کو پھر اسی فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا جہاں سے اٹھا کر اس نے شبنم کو ایک سچے رشتے میں باندھنے کی

کوشش کی تھی۔

وحشی سعید کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات میں جہاں ایک طرف نیا پن اور تنوع ہے وہیں افسانے کے ٹریٹمنٹ اور زبان و بیان پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ انکے افسانوں کے عنوانات بھی اپنے اندر افسانوں جیسی ہی معنویت کے حامل اور معنی خیز ہیں اور قاری کو غور وفکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہ ایک ایسی انفرادیت اور تخلیقی ہنرمندی ہے جو انہیں دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کی انکے بعض افسانوں کا اختصار ان کے یہاں جملوں کی ساخت اور غیر ضروری لفظوں کے استعمال سے پرہیز کے سبب بھی ہے اور یہ خصوصیت بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔

''سودا'' میں وحشی سعید نے ایک بے حد عام سے مسئلے کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے جس میں میجر دُرّانی ایک کروڑ روپئے اور پرموشن کا لالچ دیکر اپنے ہی ماتحت ایک سپاہی شوکت کو، اپنی اپاہج اور اندھی بہن سے شادی کا آفر دیتا ہے مگر شوکت کے منع کرنے کے بعد میجر درانی اپنی شکست کے احساس سے بوجھل ہوجاتا ہے۔اس افسانے میں خاص بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے انحطاط پذیر قدروں اور زوال آمادہ معاشرے میں بھی ان لوگوں کے یہاں خودداری اور عزتِ نفس کے محفوظ ہونے کا احساس دلایا ہے جو معاشی طور پر کمزور ہیں اور یہ بات واقعتاً سچ بھی ہے۔

''بھنگی''، وحشی سعید کا ایک بے حد اہم اور نازک افسانہ ہے جو نہ صرف اپنے موضوع کے لحاظ سے بلکہ اپنی بنت اور تکنیک کے لحاظ سے بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار صمد بھنگی ہے اور بھنگی ایک ایسا لفظ ہے جسے سن کر ہی سماج کے نام نہاد شریف اور ذات پات میں یقین رکھنے والے افراد کے منھ کا ذائقہ کڑوا ہوجاتا ہے۔صمد بھنگی اگر چہ سڑکوں کو صاف کرنے کا کام کرتا تھا مگر اس کلیے کو

www.urduchannel.in

بدلنا چاہتا تھا کہ بھنگی کا بیٹا صرف بھنگی ہی ہوسکتا ہے اور کچھ نہیں۔ ہزار منتوں اور مرادوں کے بعد خدا نے جب اسے بیٹا عطا کیا تو اس نے یہ ارادہ کرلیا کی وہ اپنے بیٹے کو بھنگی نہیں بنائے گا۔صمد بھنگی نے اپنے بیٹے کو اسکول میں داخل کرا دیا اور اسے بڑا آدمی بنانے کی ٹھان لی مگر صمد بھنگی کے بیٹے نے نہ معلوم وجوہات کے سبب ایک سال کے بعد اسکول چھوڑ دیا اور آخر کار اپنے والد صمد کے ساتھ ہی بھنگی کے کام پر لگ گیا۔ایک دن لال چوک کی سڑک صاف کرتے ہوئے صمد بھنگی کا بیٹا ایک گاڑی کی زد میں آکر دنیا سے رخصت ہو گیا اور اسکا خون سڑک پر پھیل گیا۔افسانہ نگار نے اس افسانے کا اختتام بہت عمدہ اور موثر طریقے سے کیا ہے بالکل نظموں کے کلائمکس کی طرح۔

''میں اس کو وہ نہ بنا سکا جو وہ بننا چاہتا تھا اس لئے خدا نے اس کو واپس بلا لیا۔'' دوسرے دن میں نے صمد کو اپنے ہی بیٹے کے خون کے دھبوں کو صاف کرتے ہوئے دیکھا......کیونکہ...وہ.....بھنگی تھا۔'' افسانے کا یہ کلائمکس واقعی ضمیر کو جھنجھوڑنے والا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے کہ کیا وقعی ہمارا معاشرتی نظام ایک بھنگی کے بیٹے کو بھنگی ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کتاب کا ایک اور اہم افسانہ ''سڑک جا رہی ہے'' ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے دیگر افسانوں سے یکسر مختلف ہے۔اس افسانے میں وحشی سعید نے انسانی رشتوں اور جسمانی ضرورتوں کے درمیان جنم لیتی ہوئی کہانیوں کو نہایت خوبصورتی سے مصور کیا ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے انسانی رشتوں کی پاکیزگی کو سماج کی تہذیبی قدروں کی صحت کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔

ایک امیر اور بظاہر باعزت شہری بانکے لال اور ایک طوائف چاند بائی کے درمیان قائم ہوئے ناپاک رشتوں کے نتیجے میں نینا کی گمراہی اور بھٹکاؤ کو وحشی سعید نے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

نینا جو ایک ناجائز رشتے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے جب اسکول میں داخل ہوتی

ہے تو وہاں اس کی دوستی رمیش سے ہوتی ہے اور بعد میں جنسی رشتے کی صورت میں سامنے آتی ہے اور جب اسکی ماں چاند بائی رمیش کو نینا کے منھ کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھ لیتی ہے اور اسے تھپڑ رسید کر کے اس طرح کے رشتے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔اور گھر میں قید کر دیتی ہے۔مگر جب بانکے لال کا نوکر موہن نینا سے جنسی رشتے قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بانکے لال بری طرح متاثر ہوتا ہے اور پھر ایک دن وہ موہن کے باپ سورداس سے موہن کا ہاتھ اپنی بیٹی کے لئے مانگتا ہے مگر جب سورداس یہ کہتا ہے کہ ''تم شاید یہ بھول گئے ہو کہ تم اور تمھاری بیوی اپنے ساتھ کوئی ماضی رکھتے ہو۔'' تو بانکے لال بری طرح ٹوٹ جاتا ہے اور اسی صدمے کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

آخر کار چاند بائی مجبور ہو کر ایک دن نینا کا ہاتھ ایک بوڑھے آدمی ہری رام کے ہاتھ میں سونپ دیتی ہے۔جہاں اس کی جنسی خواہشات کی تسکین نہیں ہوتی ہے۔اپنی جنسی آسودگی کی خاطر نینا، ہری رام کے نو جوان بیٹوں شیکھر اور برج سے ناجائز رشتے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔جب اس حقیقت کا پتہ ہری رام کو ہوتا ہے تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور پھر برج اور نینا ایک دوسرے کے ساتھ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور اسی خونی بنگلے میں منتقل ہو جاتے ہیں جہاں بانکے لال اور چاند بائی کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات پروان چڑھے تھے اور جس کے نتیجے میں نینا پیدا ہوئی تھی۔

''سڑک جا رہی ہے'' وحشی سعید کا قدرے طویل افسانہ ہے مگر اپنے پلاٹ، کرافٹ اور زبان و بیان کی خوبصورتی اور بنت کے سبب یہ افسانہ، زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا بے حد اہم افسانہ قرار پاتا ہے۔

''نیلام'' دو ایسے دوستوں کی کہانی ہے جن کے سفر کا آغاز تو ایمانداری، سچائی اور اصولوں کے راستے پر ہوتا ہے مگر درمیان سفر ایک دوست فاروق مصلحت اندیشی کا

www.urduchannel.in

شکار ہو جاتا ہے اور اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرکے زندگی میں آسودگیاں اور آسائشیں حاصل کر لیتا ہے یہاں تک کہ اپنے دوست کے پیار پر بھی قبضہ کر لیتا ہے جبکہ دوسرا دوست اصول اور ایمانداری کے راستے پر چل کر اپنی بے کیف زندگی میں مست رہتا ہے اور جب کافی عرصہ بعد شہر لوٹتا ہے تو حیران ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب اگر وہ اپنی ایمانداری اور سچائی کو نیلام بھی کرے تو کوئی اس کا خریدار بھی نہ ملے گا۔

''خدا کون ہے'' وحشی سعید کا ایک ایسا افسانہ ہے جو غربت، ضرورت اور لالچ کے درمیان انسانی نفسیات کو نہایت خوبصورتی سے پینٹ کرتا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کو ایک دن سڑک پر پڑا ہوا ایک ہزار روپئے کا نوٹ ملتا ہے اور وہ اسے اٹھا لیتا ہے۔ مگر نوٹ اٹھانے کے بعد اس کے ذہن میں خیالات تیزی سے گردش کرنے لگتے ہیں۔ افسانے کا یہ کردار غریب اور ضرورت مند ہے پانچ ہزار روپئے کی تنخواہ پانے والا معمولی ملازم جس پر ایک بڑے کنبے کی ذمے داری ہے اور ضرورت مند بھی۔ نوٹ پا کر وہ اپنے ذہن میں اپنی ضرورتوں کا حساب کرنے لگتا ہے مگر دوسرے ہی پل اسکے ذہن میں یہ خیال بھی سر اٹھانے لگتا ہے کہ ممکن ہے ہزار روپئے کا یہ نوٹ کسی بچے سے کھو گیا ہو اور وہ اسے تلاش کر رہا ہو اور نہ ملنے کی حالت میں وہ گھر کس طرح جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ گھر کے باہر سے وہیں لوٹ آتا ہے جہاں سے یہ نوٹ اسے ملا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو کچھ تلاش کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ روپیہ تلاش کر رہا ہے یا کچھ اور۔ اور جب کہانی کا دوسرا کردار اسے بتاتا ہے کہ اس سے ہزار روپیے کا نوٹ کھو گیا ہے اور وہ ایک غریب آدمی ہے، اسکی بیٹی کی شادی ہے اور وہ یہ نوٹ کسی دوست سے ادھار مانگ کر لایا ہے اور جب وہ اپنے دوست سے روپے کھو جانے کی بات کہے گا تو وہ یقین نہیں کرے گا۔

افسانے کے دوسرے کردار کی پریشانی اور غریبی دیکھ کر وہ ہزار روپئے کا نوٹ واپس کر دیتا ہے۔ اس کہانی میں وحشی سعید نے سماج کے ایک ایسے حساس کردار کی

تشکیل کی ہے جو غریب اور ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ایمانداری اور شرافت کا راستہ نہیں چھوڑتا۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اب بھی ہمارے معاشرے کے مڈل کلاس طبقے میں تہذیبی وراثتیں اور اقدار باقی ہیں۔ وحشی سعید کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں سماجی سروکار اور عام آدمی کے مسائل و مصائب کو نہایت خوبصورتی سے پیش کرنے کی ہنرمندی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں انسانی دردمندی اور تہذیبی شکست و ریخت کو بھی بعض افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔

''جب ممبئی جھک جائے گی'' ایک تیز رفتار بڑے اور میٹرو شہر کی کہانی ہے جس میں وحشی سعید نے امیری اور غریبی کے درمیان موجود کھائی کو نہایت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ افسانے کا عنوان دراصل اشارہ ہے بھونچال کا جو ممبئی میں تو ذرا سی دیر کو آتا ہے مگر انسانی خودغرضی و خلوص اور امیری و غریبی کے درمیان ایک دیرپا اور واضح خلا چھوڑ جاتا ہے۔ اس افسانے کے ذریعہ اس سچائی کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے کہ تیز رفتار شہروں میں تہذیبی قدروں، خلوص اور انسانی ہمدردی کی تلاش اور پیشکش دونوں فضول ہیں، کہ جہاں دولت کی فراوانی ہوتی ہے وہاں ضمیر سب سے پہلے مر جاتا ہے۔

''یہ تہذیب یافتہ لوگ'' میں بھی وحشی سعید نے انسانوں کے درمیان اونچ نیچ اور رنگ و نسل کو افسانے کا موضوع بنایا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ انسان چاہے جتنا بھی تہذیب یافتہ اور ترقی پسند اور تعلیم یافتہ ہو جائے رنگ و نسل کے فرق اور سماجی رسم و رواج اور معاشرتی بندھنوں سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔

''الجھے لمحے'' انسانی جبلت اور اس کی پیچیدہ نفسیات پر مشتمل ایک ایسی کہانی ہے جسمیں ایک کردار طاہر اپنے دوست کی بیوی کو برہنہ دیکھنا چاہتا ہے اور اسکے ہزار ہا بوسے لینا چاہتا ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے ایک ایسے موضوع کو چھونے کی کوشش کی ہے جو سماجی اقدار کے خلاف ہے اور اسے ہمارا معاشری اچھی نظر سے نہیں

www.urduchannel.in

دیکھتا مگر وحشی سعید اپنی تخلیقی ہنرمندی کے سہارے اس اچھوت موضوع کو بھی نہایت عمدگی سے پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

وحشی سعید کا افسانوی مجموعہ ’’سڑک جارہی ہے‘‘ کے افسانوں کا غیر جانبدار مطالعہ کریں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پلاٹ اور موضوعات کا قحط نہیں ہے ان کی سوچ کا کینوس وسیع ہے اور وہ اپنے مطمعِ نظر کو کاغذ پر منعکس کرنے پر پوری طرح قادر ہیں ۔اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات و واقعات کو مشاہدات اور تجربات کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے، افسانوں کے مروجہ اسلوب سے ہٹ کر کہانی کہنے کا نیا انداز اختیار کرتے ہیں جو یقینی طور پر موجودہ عہد میں مضمحل اور غبار آلودہ ادبی فضا میں ایک طرح کی تازگی کا احساس کراتے ہیں ان کے یہاں بھلے ہی منظر نگاری اور کردار نگاری کا فقدان ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے عام موضوعات کو بھی اپنے پاور فل ڈکشن اور زبان و بیان کی انفرادیت سے متاثر کن افسانوں کا پیرہن عطا کیا ہے جس کے سبب وہ یقینی طور پر اپنے ہم عصروں میں الگ پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

وحشی سعید کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت جو مجھے نظر آئی وہ ان کے جملوں کی ساخت اور معنی خیزی ہے۔ان کے یہاں افسانوں کا اختصار، موضوع کے عدم پھیلاؤ کے سبب نہیں بلکہ جملوں کے کساؤ ، استعاروں کے استعمال اور کرداروں کے درمیان مکالموں سے کسی حد تک پرہیز کی وجہ سے ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی خوبی ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ وحشی سعید کے یہاں افسانوں میں بعض جملے بے حد معنی خیز ہوتے ہیں۔چند مثالیں اپنے اس خیال کی تائید میں پیش کرتا ہوں۔

’’فرشتے بے حس ہوتے ہیں۔عمل کے دائرے میں قید حکم کے غلام‘‘ ....
(افسانہ الجھے لمحے)

’’کیا یہ پتھر کی مورتی صدیوں اسی طرح کھڑی رہے گی‘‘.....(افسانہ دل والی)

اس طرح کے اور بہت سارے جملے پیش کئے جا سکتے ہیں مگر طوالت کے سبب گریز کرتا ہوں۔وحشی سعید کے افسانوی سفر کا یہ مختصر سا جائزہ اس امید اور یقین کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے کہ چونکہ ان کا تخلیقی سفر جاری ہے لہٰذا وہ ان افسانوں کے آگے کا سفر اختیار کریں گے موضوعات کی سطح پر بھی اور اسلوب اور ڈکشن کی سطح پر بھی۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

حیدر قریشی کے افسانوں کی حقیقت

حیدر قریشی کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں کئی دشاؤں میں روشن ہیں، وہ بیک وقت ایک کامیاب جدید شاعر بھی ہیں اور صاحبِ طرز افسانہ نگار بھی۔اس کے علاوہ ان کے یہاں نظم ونثر کا سنجیدہ تنقیدی شعور بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔حیدر قریشی کے یہاں نئے تخلیقی تجربات اور نئی شعری اصناف کو خوش آمدید کرنے کا پر خلوص جذبہ بھی موجود ہے۔اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پنجابی لوک صنف ماہیا کو، اردو میں اپنے صحیح وزن اور فارم میں رائج کرنے میں بے حد نمایاں رول ادا کیا ہے۔

''روشنی کی بشارت'' حیدر قریشی کے ان افسانوں کا انتخاب ہے جو اپنے پیرایۂ اظہار، موضوعات اور منفرد اسلوب کے سبب اردو افسانوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔روشنی کی بشارت میں شامل افسانے جدید طرزِ اظہار کا عمدہ نمونہ ہیں مگر ان افسانوں پر تجریدیت، ابہام، انتشار، قنوطیت اور بے چہرگی جیسے الزامات عائد نہیں کیے جاسکتے۔حیدر قریشی کے افسانوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر فہیم اعظمی یوں رقم طراز ہیں۔

''حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں، جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے'' ڈاکٹر فہیم اعظمی کی اس رائے کی روشنی میں روشنی کی بشارت کا مطالعہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں کہانیاں علامتی/اساطیری ہونے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر ہمارے معاشرے میں عام آدمی کے مسائل و مصائب کا براہِ راست اظہار ہیں، جس سے ان کی انسانی ہمدردی اور اپنے اردگرد کے ماحول سے سروکار کا اندازہ ہوتا ہے۔

حیدر قریشی کے افسانوں کی تکنیک ، پلاٹ اور ان کا ٹریٹمنٹ عام کہانیوں سے مختلف اور منفرد ہے، ان کی بیشتر کہانیوں میں داستانوی رنگ اور فضا غالب ہے، مگر ان کا اسلوب ان افسانوں کو غیر معمولی اور غیر ضروری تحیرات اور تجسس سے پاک رکھتا ہے۔حیدر قریشی اپنے فکر و احساس کی روشنی کو تجربے کے منشور سے گزار کر روحانی/مذہبی عقیدوں کا ایمان افروز اسپیکٹرم (spectrum) تخلیق کرتے ہیں جو یقینی طور پر ان کی کہانیوں کو روشنی کی بشارت سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کے یہاں روشنی ایک کلیدی لفظ ہے اور مرکزی استعارے کی حیثیت سے، ان کی کہانیوں کو تہ در تہ معنویت سے ہم کنار کرتا ہے۔یہ روشنی جب باطن سے منعکس ہوتی ہے تو درویشوں، قلندروں اور صوفیوں کے قلوب کو منور اور معطر کرتی ہے جو انسان کو اپنی ذات کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان افروز روحانی عقیدوں اور جذبوں کے روشن جہان میں لے جاتی ہے۔افسانہ روشنی کی بشارت کا مرکزی کردار (جو حیدر قریشی خود ہیں) شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر اعلان کرتا ہے۔

'' لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لاکر خود کو روشنی سے محروم کر لیا ہے......لوگو!

تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے۔'' روشنی کی بشارت سے ایک اقتباس

'' اچانک ساری روشنیاں گل ہوگئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہوگیا ہے۔۔۔تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھ لو کیا ہوتا ہے، میں اس سے یہ کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیوں کہ روشنیاں پھر آگئی ہیں ، میرا اندھا پن بھی آگیا ہے''۔

(اندھی روشنی سے اقتباس)

www.urduchannel.in

"مجھے روشنی عطا کرنی شروع کردی، روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک ہالے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے۔" ......
(حوا کی تلاش سے اقتباس)

"روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے، اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کروگے"۔ (حوا کی تلاش سے اقتباس)

محولہ بالا اقتباسات میں روشنی ایک ایک کلیدی استعارہ ہے، جو کبھی انسان کے ضمیر کی صداقتوں کے بازگشت سے پیدا ہوتی ہے، کبھی مراقبے اور مراجعت کے نتیجے میں نمو پزیر ہوتی ہے، تو کبھی انسان کے خود آگہی کے سفر میں مشعلِ راہ بن جاتی ہے۔ میرے نزدیک، حیدر قریشی کے افسانوں میں یہ وہ روشنی ہے جس میں انسان کی ذات اس پر منکشف ہوتی ہے۔

اپنی کہانی روشنی کی بشارت میں حیدر قریشی نے جب سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ ہاتھ میں لے کر روشنی کی بشارت دی تو لوگوں نے تمسخر اڑایا، یہاں تک کہ ان کی ماں نے بھی انہیں تشویشناک نظروں سے دیکھا، ان کی بیوی نے بھی سنجیدگی نہیں دکھائی۔ ایسا ہر دور میں ہوتا ہے سچائی کی راہ پر چلنے والے اور بھلائی کی راہ دکھانے والے ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اور لوگوں کی تشویش کا شکار بھی۔ تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، طعنے جھیلتے ہیں، مگر جن کے دلوں میں صداقت اور ایمان کی روشنی جلوہ گر ہوتی ہے، جن کے باطن روشن ہوتے ہیں وہ آخر کار ایک دن اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں، جس کا ثبوت حیدر قریشی نے روشنی کی بشارت میں مبارکہ اور عفت کے اس بیان کی روشنی میں فراہم کیا ہے۔

"باہر بہت سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آئے

ہوئے ہیں۔"

کہانی اندھی روشنی میں حیدر قریشی نے اس سچ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادّی روشنیوں یعنی دنیاوی عیش و آرام، آسائشیں اور آسودگی کے حصول میں انسان اندھا ہو جاتا ہے یعنی اپنے ضمیر اور باطنی توانائیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

کہانی حوا کی تلاش میں انہوں نے یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان جب خدا کے سامنے خود سپردگی کے احساس سے گزرتا ہے تو روشنی اس کے باطن میں نمودار ہونے لگتی ہے اور وہ رضائے الٰہی کے عظیم جذبے سے گزر کر انکشافِ ذات کے مقدس جذبے سے سرشار ہونے لگتا ہے۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ حیدر قریشی کے افسانوں کا مرکزی کردار بار بار اپنی ذات کی دریافت کے لامتناہی عمل سے گزرتا ہے۔ وہ بار بار خود سے سوال کرتا ہے، میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ یہ کیسا کشف ہے؟ یہ کیسا گیان ہے؟ انکشافِ ذات کی کوشش کے عمل میں یہ سارے سوالات فطری ہیں۔ مگر خوبصورت بات یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں ان سوالات کے جوابات بھی فراہم کرتے چلے جاتے ہیں، جو نفسیاتی، نظریاتی اور روحانی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں ایک اور خصوصیت توجہ طلب اور دلچسپ ہے کہ ان کی کہانیاں اکثر ایک بہت چھوٹے اور معمولی واقعے سے شروع ہوتی ہیں، مگر اپنے تخلیقی سفر میں تلاشِ ذات کے علاوہ مذہبی جذبوں اور عقیدوں کے مختلف رنگوں کے منظروں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔

کہانی "پتھر ہوتے وجود کا دکھ" کا آغاز بھی بظاہر ایک معمولی سے واقعہ سے ہوتا ہے، جس میں کہانی کا مرکزی کردار ایک بچہ ہے، جو جادو کی کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اسے عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے، تبھی پڑوس کی ایک بچی بھی اس کھیل کی حیرتوں میں شریک ہو جاتی ہے لیکن جیسے جیسے یہ کہانی آگے بڑھتی ہے یہ دونوں کردار بھی اپنی

www.urduchannel.in

سرحدیں عبور کر کے غیر شعوری طور پر جوانی کے حیرت انگیز تجربات کے گواہ بن جاتے ہیں اور پھر کہانی پر فلسفیانہ رنگ غالب ہونے لگتا ہے۔جس کا ثبوت ان مکالموں سے فراہم ہوتا ہے۔

”ہم جو زندہ ہیں، کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟“

”میرے بائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے، جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور جسم سے اتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں“

”میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے“

”میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتا ہوں“

حیدر قریشی ایک ایسے تخلیقی فنکار ہیں، جن کے یہاں موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی رنگارنگی دونوں موجود ہیں اور ان کی کہانیوں کو معانی و مفاہیم کے نئے ذائقوں سے روشناس کراتی ہیں، وہ نظم و نثر پر یکساں تخلیقی قدرت رکھتے ہیں۔بقول دیویندر اسر۔

”حیدر قریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے، سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے، ایسی کہانیوں میں اس نوع کا سچ نہیں ہے جسے اکثر ہم مجسم کائناتی سچ، سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے، روح کا سارا آکاش ہے، جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوتِ متخیلہ ہے۔“

☆☆☆

دکن کی پیش روغزلیں۔ایک جائزہ

تحقیق ایک محنت طلب اور صبر آزما عمل ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں مگر اب ایسے لوگ خال خال ہی موجود ہیں جنکے یہاں محنت، ایمانداری اور خلوص سے تحقیق کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اسلم مرزا کا شمار موجودہ عہد میں ایسے ہی محققین میں کیا جاتا ہے جن کے یہاں تحقیق کے عمل اور اصول وضوابط سے انصاف کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اسلم مرزا ایک کثیر الجہت قلم کار ہیں اور بیک وقت محقق، شاعر، نقاد اور مترجم ہیں۔ زیر نظر کتاب ”دکن دیس کی پیش روغزلیں“ ان کی تازہ ترین تحقیقی کتاب ہے جس میں سو سے زائد قدیم دکنی شعراء کے کلام اور مختصر کوائف اور حالاتِ زندگی کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب اس لئے بھی قابل ستائش ہے کہ اب تک اس موضوع پر تفصیلی اور با قاعدہ کام نہیں ہوا ہے، کئی لوگ اس موضوع سے سرسری گذر گئے جبکہ کئی محققین نے اپنا دائرہ کار دکن کے چند مشہور شعراء تک ہی محدود رکھا ہے۔اسلم مرزا اس اعتبار سے بھی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے بیجاپور اور گول کنڈہ کے علاوہ اپنی تحقیق کا دائرہ آصف جاہی عہد کے دکنی شعراء تک پھیلا دیا جس کے سبب اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور معنویت کا کینوس وسیع ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس موضوع پر ریسرچ کرنے والے طلباء کے لئے یہ کتاب

www.urduchannel.in

نہ صرف مشعلِ راہ ثابت ہوگی بلکہ ہماری ادبی وراثت کے معتبر حوالے کی حیثیت سے بھی محفوظ رہے گی۔

زیرنظر کتاب کا پیش لفظ اشفاق انجم نے نہایت عرق ریزی سے لکھا ہے اور دکنی اردو کی پیدائش اوراس کے سمت ورفتار کے حوالے سے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کردیا ہے، میرے لئے یہ معلومات نئی اوراہم ہے کہ اردو کی پیدائش، اسکی نشونما اور پرورش دکن میں ہوئی انکے مطابق محمد بن تغلق کے عہد میں ساری دلّی اٹھ کر دولت آباد (دکن) آ گئی تھی، اہلِ دکن سے ارتباط کی بنا پر دہلی والوں پر دکنی زبان کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ محمد بن تغلق برسوں دکن میں رہا اس نے یہاں قلعے اور عمارات بھی تعمیر کروائیں اور جب واپس ہوا تو اپنے ساتھ دکنی زبان بھی واپس لے گیا۔ اب یہ ایسی معلومات ہے جس سے ادب کے بہت سارے قارئین نابلد ہوں گے، انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دولت آباد (دکن) پر تغلق کے قبضے اور بزرگان چشت کی آمد سے دلی اور دکن میں مظبوط تعلقات استوار ہوئے، لوگوں کی آمد ورفت شروع ہوئی اور دکنی زبان ہی نہیں اس کا ادب بھی دہلی پہنچنے لگا۔

زیرنظر کتاب دکن دیس کی پیش رو غزلیں میں اسلم مرزا نے دکنی اردو کے ۱۱۷ نمائندہ اور اہم شعراء کا اجمالی تعارف مع نمونہ کلام مستند اور معتبر حوالوں کے ساتھ رقم کردیا ہے جس میں محمد قلی قطب شاہ، سراج اورنگ آبادی، ولی اورنگ آبادی، مشتاق بیدری، لطفی بیدری اور ملا وجہی سے لے کر لالہ جے کشن داس، لعل چند رنگیں اورنگ آبادی، لطف النساء بیگم امتیاز اور قمر اورنگ آبادی تک دکنی شاعری کی ایک کہکشاں روشن ہے جسے جمع کرنے اور شعراء کے کوائف حاصل کرنے کے لئے یقینی طور پر اسلم مرزا نے باریک بینی سے برسوں مطالعہ کیا ہے اور اپنے اس ذہنی سفر کے دوران انہوں نے جن کتب اور حوالوں سے استفادہ کیا، انکی فہرست بھی کتاب کے آخر میں فراہم کردی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی اس کتاب کی تکمیل میں کتنی

جانفشانی سے محنت کی ہے، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قدیم دکنی الفاظ کے معنی بھی شاعر کے کلام کے آخر میں دیے گئے ہیں جس سے قاری کو اشعار کی تفہیم میں آسانی ہوجاتی ہے۔

کتاب میں شامل پیش گفتار میں اسلم مرزا نے اس کے وجود میں آنے کا سبب بھی بیان کیا ہے، ان کے مطابق اورنگ آباد سے جاری ہونے والے ادبی رسالے فنون کے مدیر کی فرمائش پر انہوں نے اورنگ آباد کے کئی قدیم شعراء کی غزلیں فراہم کی تھیں، پھر ۲۰۱۵ میں نذیر فتح پوری کی ایما پر اسلم مرزا نے دکن کے قدیم شعراء کی غزلیں مع تعارف اور دکنی الفاظ کی فرہنگ کے ساتھ اسباق میں اشاعت کے لئے روانہ کیں۔ اسطرح دکنی شعراء کے کلام کو جمع کرنے کا سلسلہ بن گیا اور آخر کار کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اسلم مرزا نے کشادہ دلی سے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ انکی یہ تحقیق حتمی نہیں، کیونکہ بعض شعراء کی غزلیں اور کوائف انہیں نہیں مل سکے، انہوں نے یہ امید بھی ظاہر کی ہے کہ آئندہ محققین ان کے کام کو مزید آگے بڑھانے کا فریضہ ادا کریں گے۔

کتاب میں شامل شعراء کا کلام پڑھنے سے دکنی اردو میں لسانی سطح پر بتدریج ہونے والی تبدیلیوں اور سمت ورفتار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور پھر قدیم دکنی الفاظ کی فرہنگ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلم مرزا نے جس عرق ریزی سے ان الفاظ کے معانی ومفاہیم درج کئے ہیں اسکی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کتاب کے مطالعے سے میرے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ اس طرح کے موضوع کو زیادہ تر محققین بھاری پتھر سمجھ کر چوم کر چھوڑ دینے میں ہی عافیت کیوں سمجھتے ہیں۔ اسلم مرزا کا کمالِ تحقیق یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے ایسے دکنی شعراء کا کلام وتعارف اس کتاب میں شامل کردیا ہے جن پر اب تک ہمارے پیش رو محققین کی نگاہ نہیں پڑی تھی اس اعتبار سے اسلم مرزا کو امتیاز ووقار حاصل رہے گا۔

www.urduchannel.in

اشفاق انجم کے مقدمہ سے مجھ ایسے طالب علم کی معلومات میں یہ اضافہ بھی ہوا کہ قدیم دکنی اردو، دکن میں اردو رسم الخط میں لکھی جاتی رہی جب کہ شمالی ہند میں کھڑی بولیوں کا رسم الخط دیوناگری ہی رہا ہے۔ لہٰذا بعض لوگوں کا یہ خیال باطل ٹھہرتا ہے کہ اردو زبان کی جائے پیدائش شمالی ہندوستان ہے، سچ تو یہ ہے کہ کھڑی بولی کے ادبی نمونے سب سے پہلے اردو رسم الخط میں دکن میں ہی ملتے ہیں زیرِ نظر کتاب ''دکن دیس کی پیش رو غزلیں'' میں شامل زیادہ تر غزلیں اردو کی ابتدائی ادبی صورت حال کی مظہر ہیں لہٰذا ان کے موضوعات، اسلوب اور طرزِ اظہار پر گفتگو کرنا نہ تو مقصود ہے اور نہ ہی موجودہ عہد کی غزلیہ شاعری سے ان کا موازنہ مناسب ہے، اگرچہ ان غزلوں کے موضوعات میں ایک طرح کی یکسانیت ہی نظر آئے گی کیونکہ یہ جس عہد کی شاعری ہے اس میں سماجی اور سیاسی صورتِ حال کا منظر نامہ یکسر مختلف تھا اور غزل کی مروجہ ہیئت، اس کے موضوعات اور اسلوب میں کسی طرح کے تجربے کا کوئی concept بھی نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر میں یہاں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اس کتاب میں شامل غزلیں ہماری تہذیبی اور تاریخی وراثت کا ناقابلِ فراموش حصّہ ہیں، جن کی حفاظت ہماری ادبی، تہذیبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے، اس کتاب کی اشاعت اسی سلسلے کی کڑی کہی جاسکتی ہے۔ میں ایک بار پھر اسلم مرزا کو اس تحقیقی کارنامے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی ہمیں اپنے تحقیقی کام سے روشناس کراتے رہیں گے۔

میخانۂ اردو کا پیرِ مغاں۔ ایک جائزہ

میخانۂ اردو کا پیرِ مغاں کے ایل نارنگ ساقی کی ذات، اردو سے انکی شدید محبت اور ادبی بزم آرائیوں پر نذیر فتح پوری کے ذریعہ ترتیب دی گئی ایک ایسی کتاب ہے جو اردو کی تہذیبی، ثقافتی اور ادبی صورتِ حال کا عصری منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف نارنگ ساقی کی ہمہ رنگ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے وہیں دوسری طرف اردو سے ان کی بے لوث اور بے پناہ محبت کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔ قابلِ مبارک باد ہیں نذیر فتح پوری کہ انہوں نے اردو کے ایک ایسے ادیب اور ادب نواز شخصیت پر کتاب مرتب کی جس نے اردو دوستی کا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

کے ایل نارنگ ساقی کی تالیف کردہ کتابیں ''ادیبوں کے لطیفے'' اور ''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' ایسی کتابیں ہیں جو اردو میں اپنے موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے اولین نہ سہی مگر اتنی دلچسپ اور منفرد ہیں کہ اردو ادب میں خوبصورت اضافہ کہی جاسکتی ہیں۔ نارنگ ساقی نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ چھوٹے بڑے بہت سارے ادیبوں

www.urduchannel.in

کی شوخیوں ،خوش مذاقیوں اورخوش کلامیوں کے حوالے سے ایک قابلِ قدر مواد جمع کر کے قارئین کے لئے طمانیت کا سامان فراہم کردیا ہے۔جس کے لئے اردو ادب کے سنجیدہ قارئین انہیں دیر تک یاد رکھیں گے۔

میخانۂ اردو کا پیرِ مغاں کے مطالعے کے دوران نارنگ ساقی کی شخصیت کے کئی پہلوا جاگر ہوتے ہیں اوران سے براہِ راست ملاقات نہ ہونے کے باوجود کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کی رفاقت اورقربت کا احساس ہوتا ہے۔ان کی مہمان نوازی،خلوص، اخلاق ، بھائی چارگی اور انسان دوستی کے حوالے سرحدوں کی قید و بند سے آزاد ہیں۔ پاکستان سے آنے والے ادباء،شعراء ہی نہیں بلکہ دیگر پاکستانی بھی انکی مہمان نوازی سے یکساں طور پر فیضیاب ہوتے ہیں۔ مہمانوں کے ساتھ نارنگ ساقی کا یہ سلوک اسلئے بھی قابلِ ذکر ہے کیونکہ وہ اپنی مہمان نوازی کے دوران ہندوستان کی ادبی برادری کی نمائندگی ہی نہیں بلکہ ایک پورے ملک کی تہذیبی اورثقافتی قدروں کی نمائندگی کررہے ہوتے ہیں۔

کتاب میں شامل اپنی تحریر ''دیکھو ہم نے ایسے بسر کی......''میں نارنگ ساقی نے اپنے بارے میں جومعلومات فراہم کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے نسبتاً کم خوش آئند لمحوں میں بھی ایمانداری اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ورکسی نہ کسی روپ میں اردو کی خدمت اور ادبی سرگرمیوں سے خود کو جوڑے رکھا۔اور میرے نزدیک یہ ایک بڑی بات ہے اور مجھے یقین ہے کہ اردو کا مستقبل ایسے ہی جیالوں کے سبب روشن اورتابناک ہے۔اب اس سے بڑی اردو کی خدمت اور کیا ہوگی کہ پاکستان سے دہلی آنے والے تمام شعراء اور ادباء کو اپنا ذاتی مہمان بنانا اورانکی ضیافت میں ہرطرح کے آرام اورآسائش کا خیال رکھنا،اوروہ بھی محض اردو سے محبت کی خاطر۔میری دعا ہے کہ نارنگ ساقی جیسے محبانِ اردو کی سرپرستی اردو پر تا دیر قائم رہے،کہ اردو کے سیکولر ہونے کا اس سے بڑا اورکوئی جواز نہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں نارنگ ساقی کی ذات اورشخصیت کے حوالے سے اپنی محبت، خلوص اور رفاقتوں رقم کرنے والے قلمکاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔جگن ناتھ آزاد،رتن سنگھ،شین کاف نظام،شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ،بلراج کومل ،جوگندر پال اور مختار شمیم سے لے کر ف س اعجاز،فیاض رفعت،پروفیسر علی احمد فاطمی،عطاءالحق قاسمی،زبیر رضوی،رؤف خیر اورنذیر فتح پوری تک ایک کہکشاں روشن ہے اسکے علاوہ نئی نسل کے فنکاروں میں مزاق مرزا،مشتاق صدف،ڈاکٹر مولا بخش، سیدہ نسرین نقاش،نصرت ظہیر،وقار قادری،سیفی سرونجی اورڈاکٹر اسلم جمشید پوری وغیرہ نے نارنگ ساقی سے اپنی عقیدتوں کولفظوں کی خوشبو سے معطر کیا ہے۔اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ نارنگ ساقی کی شخصیت کومختلف زاویوں میں منعکس کرنے والے ان قلمکاروں میں کئی نسلوں اورکئی مکاتیبِ فکر سے وابستہ قلم کار شامل ہیں۔جس کے سبب ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں اور ذائقوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا ہے۔مگر ان کی شخصیت کا یہ پہلو تقریباً تمام قلم کاروں کے یہاں مشترک ہے کہ وہ بذاتِ خود خوش کلام ہیں اوران کی حسِ مزاح بیحد متحرک ہے۔

نارنگ ساقی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے منوررانا لکھتے ہیں ''تقریباً چار دہائیوں سے نارنگ ساقی اردو اور اردو والوں سے سانسوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں،شاعروں اورادیبوں کی دوستی میں اتنی بے لوثی کے ساتھ دوسرا کوئی بھی شخص ان کے مدمقابل نہیں ہے۔دراصل خاموش خدمتوں کا نور ہی انسان کو چاند اور سورج بنا دیتا ہے۔''

جوگندر پال نے نارنگ ساقی کی لطیفہ گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے''جو شخص بے سبب کھلکھلا کر ہنستا رہتا ہے وہ جیسا بھی ہو ایک منافق نہیں ہوسکتا۔آج کے سرد ماحول میں ایسے گرم جوش خنداں اور بے ضرر لوگ کہاں دکھائی دیتے ہیں،اور آجائیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ آدمی ان سے بے تکی باتیں کر کے قہقہوں کی اوٹ میں زندگی کی

www.urduchannel.in

توانائیاں سمیٹتا چلا جائے نارنگ ساقی بھی بلا شبہ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔

ایک دفعہ جب میں انکی دعوت پر اسی کے یہاں پہلی بار ملا تو مجھے لگا کہ کوئی اسے وجود کے اندر گدگدائے جا رہا ہے اور وہ بلا وجہ ہنسے جا رہا ہے۔۔ہاں! جناب، آپ کو کون نہیں جانتا......ہہ ہہ!....میں آپ کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں.... ہہ ہا!....کہ آپ تشریف لائے......ہہ!...بیٹھیے۔وہسکی سوڈے کے ساتھ یا.... ہہ ہاہہ.....''

دیپک بدکی کے لفظوں میں ''ساقی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ یاروں کے یار ہیں۔ان کی میز بانی کے سبھی قائل ہیں۔کاروباری آدمی ہونے کے باوجود ادب اور ادیبوں سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔''

زبیر رضوی نے اردو سے نارنگ ساقی کی محبت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے''میں نے اردو کے سلسلے میں مخلص اور بے لوث جذبوں سے سرشار پایا اردو سے انکا عشق کل بھی تھا، آج بھی ہے اور آنے والے دنوں میں بھی رہے گا، گذرے ہوئے دنوں میں اردو والوں کے لئے لازمی اور ناگزیر شخصیت رکھنے والے ساقی کو ایک ذرا چھیڑیے تو انکی ذات سے آج بھی رفاقت، دوستی اور محبّت کے ہزار دل پزیر راگ پھوٹ نکلیں گے......ساقی نے اردو زبان اور اردو ادیبوں کو امکان بھر توقیر دی، اپنا پیار دیا، اردو کی ہری سرخ روشنی والی شمعیں کل بھی انکی رہائش گاہ اور دفتر کے طاقوں روشن تھیں، یہ شمعیں آج بھی روشن ہیں کیونکہ ساقی نے اردو کی ابد گیر ساعتوں کے ساتھ آخری سانس تک زندگی بسر کرنے کی قسم کھائی ہے۔''

محولہ بالا اقتباسات کی روشنی میں نارنگ ساقی کا عکس دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فی زمانہ اردو اور ساقی لازم وملزوم ہو گئے ہیں اور کچھ معنوں میں اردو کا تصور ساقی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔وہ محض شاعروں اور ادیبوں کے لئے ہی ساقی گری نہیں کرتے بلکہ اردو زبان وادب کی بھی پیاس بجھاتے ہیں۔اور یہ شائدان کی مجبوری بھی ہے کہ اردو لہو کی صورت ان کی شریانوں میں گردش کر رہی ہے، یعنی اردو کے بغیر انہیں اپنے اندر

ایک طرح کا خالی پن محسوس ہوتا ہے اور یہ خالی پن انہیں کسی صورت قبول نہیں۔

نارنگ ساقی کے لئے اپنی نظم میں چندر بھان خیال نے اردو کے لئے ان کی محبت اور خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ادب کی آتماؤں اور خرد کے آشناؤں کے درمیان محبت کے چھلکتے جام تقسیم کرتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ جتنے لوگ بھی نارنگ ساقی سے ملاقات کرتے ہیں وہ انکے خلوص اور محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

نارنگ ساقی نے ادبی لطائف کو جمع کر کے انہیں قارئینِ ادب تک پہنچانے کا کام کیا ہے اور یہ ایک ایسا کام ہے جو موجودہ عہد کی پژمردگی اور قنوطیت میں ایک کارِ نیک ہی سمجھا جائے گا کیونکہ اگر یہ لطیفے کسی انسان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجانے میں کامیاب ہو جائیں تو اسکا ثواب لطیفہ سنانے والے کے حصے میں آئے گا۔زندگی میں خوش مذاقی کا سرچشمہ خود زندگی میں رونما ہونے والے حادثات و وقعات میں ہوتا ہے لطیفوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے نارنگ ساقی نے کہا ہے کہ لطیفہ وہی اچھا ہوتا ہے جو برجستہ ہو، مختصر ہو، کم سے کم لفظوں میں ظرافت سے معمور اور خوش دلی کی ساری کیفیت کو اپنے اندر حتیٰ الامکان سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ان حوالوں سے نارنگ ساقی کے جمع شدہ لطائف کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ادبی چاشنی، شوخی اور ظرافت سب کچھ ہے مگر پھوہڑ پن نہیں ہے۔مثال کے طور پر ایک لطیفہ ملاحظہ فرمائیں۔

حفیظ جالندھری بیمار ہو کر لاہور کے اسپتال میں داخل ہو گئے۔احمد ندیم قاسمی مشاعرے میں شرکت کے لئے گجرات آئے تو ملاقات پر ضمیر جعفری نے پوچھا''حفیظ جالندھری کا کیا حال ہے؟''۔قاسمی نے جواب دیا بیماری کی وجہ سے کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ضمیر جعفری نے پوچھا۔''کیا اپنے شعروں سے بھی زیادہ؟''

اب آپ اس لطیفے میں ایک طرح کی چاشنی کا احساس کریں اور اسکے اندر پوشیدہ ظرافت کا لطف اٹھائیں۔

www.urduchannel.in

نارنگ ساقی کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں وہ لطیفے بھی جمع کرتے ہیں، کتابوں پر تبصرے بھی کرتے ہیں، خصوصاً کشور ناہید کی خودنوشت ایک بُری عورت کی کتھا پر تحریر کیا ہوا انکا تبصرہ بے حد مقبول ہوا ہے اس کے علاوہ وہ خود خوش کلام اور شوخ ہیں۔ اردو کے کاز کے لئے ہمیشہ دامے، درمے، سخنے تیار رہتے ہیں۔ انکے دروازے اردو والوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ وہ شاعروں، ادیبوں کو کھلانے پلانے کا شوق بھی جنون کی حد تک رکھتے ہیں۔ اب اتنی ساری خصوصیات کا ایک شخص کے اندر مجتمع ہو جانا ایک غیر معمولی بات ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ تا دیر اسی طرح اردو کی سر پرستی فرماتے رہیں۔

☆☆☆

غضنفر کی شاعری سے ایک مکالمہ

(آنکھ میں لکنت کی روشنی میں)

غضنفر کی تخلیقی صلاحیتوں سے میری واقفیت برسوں پرانی ہے، لیکن میں انہیں صرف ایک بہترین فکشن رائٹر کی حیثیت سے ہی جانتا تھا مگر جب پچھلے دنوں انکی شاعری کی کتاب ''آنکھ میں لکنت'' موصول ہوئی تو میں ایک خوشگوار حیرت سے دو چار ہوا اور میری یادداشت مجھے برسوں پرانی لکھنو میں ہوئی انکے دفتر میں ایک ملاقات کے ان لمحوں میں لے گئی جب انہوں نے مجھے اپنے ناول ''دویہ بانی'' عنایت فرمایا تھا۔ چند منٹوں پر مشتمل یہ ایک رسمی سی ملاقات تھی جسمیں ان سے کوئی خاص گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی بس میں انکا ناول لے کر رخصت ہو گیا تھا مگر جب میں نے ان کے ناول کا مطالعہ شروع کیا تو میری دلچسپی بڑھتی گئی اور میں نے ایک ہی نشست میں پورا ناول نہ صرف پڑھ لیا بلکہ اس پر ایک تفصیلی مضمون بھی تحریر کیا جو کلکتہ سے شائع ہونے والے رسالے ترکش میں شائع بھی ہوا، انسانی نابرابری اور طبقاتی کشمکش کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول اپنے پلاٹ، زبان، اسلوب اور کرافٹ کی انفرادیت کے سبب ایک قابلِ ذکر ناول قرار دیا گیا اور برسوں تک ادبی حوالوں میں روشن رہا۔ پھر میں نے یکے بعد دیگرے غضنفر کے کئی ناولوں کا مطالعہ کیا اور یہ رائے بنانے میں حق بجانب ٹھہرا کہ وہ بلا شبہ ایک منفرد اور

www.urduchannel.in

بہترین ناول نگار اور فکشن رائٹر ہیں اور گذشتہ کئی برسوں میں لکھے گئے ناولوں میں دو یہ بانی، وش منتھن، پانی، کینچلی اور مانجھی جیسے ناول خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

آنکھ میں لکنت کا مطالعہ میرے لئے ایک خوش گوار تجربہ ثابت ہوا کہ میں غضنفر کی تخلیقی سوچ کے ایک نئے محور سے آشنا ہوا عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ کوئی افسانہ نگار جب شاعری کرتا ہے تو اس کی نثر اور نظم کے ڈکشن میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا مگر یہ مفروضہ یا کلیہ غضنفر کی شاعری کے حوالے سے سچ ثابت نہیں ہوا ان کے یہاں نثر اور نظم کی لفظیات میں نہ صرف واضح فرق ہے بلکہ لفظوں کو برتنے کی ہنرمندی بھی ان دونوں شعبوں میں مختلف اور منفرد ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں آزاد نظمیں، غزلیں اور نثری نظمیں شامل ہیں، جو اُن کی وسیع تخلیقی سوچ اور فکری میلانات کی مظہر ہیں۔ آج جب کہ شاعری کو روایتی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید تحریک اور رجحانات کے خانوں میں بانٹ کر ہمارے ناقدینِ شعر و ادب اپنی سہولت کے مطابق تخلیق کاروں کو اس میں فٹ کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ غضنفر کی شاعری ان میں سے کس خانے میں فٹ ہوگی مگر میں پورے یقین سے یہ کہ سکتا ہوں کہ ان کی شاعری براہِ راست زندگی کے مسائل و مصائب سے مکالمہ کرتی نظر آتی ہے، سیاسی، سماجی اور تہذیبی فکر و شعور سے لبریز ان کی تخلیقی سوچ شاعری کا ایک ایسا منظر نامہ خلق کرتی ہے جس سے ادب کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔

اس لحاظ سے دیکھیں تو ہمیں غضنفر کی شاعری کے ابعاد اور اعماق کو نہایت باریک بینی سے اپنے مطالعے کا حصّہ بنا کر ہی کوئی حتمی رائے قائم کرنی ہوگی اور ان کی شاعری کے ڈکشن، اسلوب اور فکری نظام کو شاعری کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر دیکھنا ہوگا کیونکہ انہوں نے کئی جگہ شاعری کے کلیشوں کو توڑ کر نئے اصول وضع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں براہِ راست مکالمے کی صورتِ حال ان کی سوچ کے سروکار کو واضح کرتی ہے اور چونکہ ان کے یہاں کوئی

پیچیدہ علامتی نظام بھی کارفرما نہیں لہٰذا ترسیل کے المیے کا کوئی مسئلہ نہیں اور نہ ہی تہ در تہ معنویت کے امکانات ان کی شاعری کو مشکل بناتے ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں استعمال ہونے والے کئی الفاظ مثال کے طور پر جمن، الگو، موبائل، گیند، مینڈک، منگرو، جھگرو، منا، ساری اور اسکرٹ وغیرہ غزل کی تہذیبی وراثتوں کے حوالے سے بعض ناقدین کے نزدیک غیر شاعرانہ قرار دے دیے جائیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ غضنفر کے یہاں شاعری کے موضوعات بالکل عصری اور relevant ہیں اور معاشرے کے ایک عام آدمی کے مصائل و مصائب سے عبارت ہیں، اور میرے نزدیک اچھی شاعری کی خصوصیت بھی یہی ہے۔

غضنفر کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے واحد نظیر نے لکھا ہے کہ ''غضنفر کربِ ذات کو کربِ کائنات اور کربِ کائنات کو کربِ کائنات بنانے کا ہنر خوب جانتے ہیں غضنفر کی غزلیہ شاعری حیات و کائنات کے مشاہدے کی رنگا رنگی کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں دنیا کے کئی روپ سامنے آتے ہیں۔ حق تلفی، بے انصافی، مصلحت کوشی، ضمیر فروشی اور رشتوں کی پامالی کا کرب زیادہ شدید ہے'' واحد نظیر کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے میں غضنفر کو اس سے آگے کا شاعر تصور کرتا ہوں اور یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے، ان کا مشاہدہ اپنے گرد و پیش سے نکل کر آفاقیت حاصل کرلیتا ہے اور یہیں ان کے اندر کا افسانہ نگار اور ناول نویس اپنی امیجری اور محسوسات کو بروئے کار لاتے ہوئے بین الاقوامی سطح کے مسائل اور بکھرتے ٹوٹتے انسانی رشتوں کو اپنی شاعری کا حصہ بنانے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔

غضنفر کی شاعری میں ایک ایسے انسان کا تصور ہے جو مثالی نہیں بلکہ اپنے مسائل و مصائب سے نبرد آزما، زندگی سے برسرِ پیکار، اپنی ضرورتوں کے حصول میں ناکام ہوکر ذہنی انتشار کا شکار، گھر دفتر اور سڑکوں پر بکھرا ہوا ایک ایسا انسان ہے جسے بیک وقت اپنی معاشرتی اور انفرادی ذمہ داریوں کا احساس ہے، یہی نہیں بکھرتی ٹوٹتی

www.urduchannel.in

تہذیبی قدروں کے درمیان زندگی کرتا ہوا ایک ایسا فرد غضنفر کی شاعری میں نظر آتا ہے جو مسلسل جدوجہد کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرتا ہے،

دفتر میں ذہن، گھر میں نگہ، راستے پہ پاؤں
جینے کی کوششوں میں بدن ہاتھ سے گیا

کسی کے پاس نہیں ہے یہاں غموں کا علاج
الجھ رہا ہے مریضوں سے اب مسیحا بھی

کئی ایسے بھی رستے میں ہمارے موڑ آتے ہیں
کہ گھر آتے ہوئے اپنے کو اکثر چھوڑ آتے ہیں

جنہیں ہم روز باہر چھوڑ آتے ہیں مکانوں سے
وہ آوازیں چلی آتی ہیں جانے کیسے بستر میں

ہم اپنے آپ کو شاید کہیں پہ کھو آئے
کہ آج شہر کا ہر فرد شاد ہم سے ہے

محولہ بالا اشعار کی تفہیم وتعبیر سے غضنفر کی گہری فکر کا اندازہ ہوتا ہے،ان کے یہاں شاعری میں ایک ایسا انسان زندگی کرنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتا ہے جو سائبر اور انٹرنیٹ عہد کی اس دوڑتی بھاگتی زندگی میں، اپنی ضرورتوں اور زندگی کے تقاضوں کے درمیان کہیں گم ہو گیا ہے اور مسلسل اپنی ہی تلاش میں سرگرداں بھی، بے رشتگی، بے یقینی، تشکیک، خوف، بے چہرگی اور تہذیبی قدروں کے زوال کے سبب کھوتے

ہوئے جذبوں اور انسانی رشتوں اور رفاقتوں کی کھوج میں اپنے وجود سے محروم ہوتے ہوئے انسان کا زندگی نامہ ہے غضنفر کی شاعری کا سارا سفر، اور یہی ان کی سوچ کے کینوس کو وسیع کر کے انہیں سنجیدہ عصری فکر سے نہ صرف ہم آہنگ کرتا ہے بلکہ اپنے معاصرین میں ممتاز و معتبر بھی کرتا ہے، حالانکہ انہوں نے خود کو شاعر کی حیثیت سے بہت زیادہ پروجیکٹ نہیں کیا مگر ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اظہار کا یہ وسیلہ بھی نہایت کامیابی سے برتا ہے۔

انکی شاعری سے گذرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک دردمند انسان ہیں اور انہوں نے آفاقی مسائل کو بھی اپنے مشاہدے اور شعری تجربے کا نہ صرف حصہ بنایا ہے بلکہ اسے اپنی شاعری میں نہایت خوبصورتی سے برتا بھی ہے، آج دنیا کے کئی ملک دہشت گردی کی زد میں ہیں اور انسانی رشتوں اور آپسی بھائی چارگی اور خیر سگالی کے جذبے کی ناقدری اور پامالی گزشتہ چند برسوں میں جس قدر ہوئی ہے وہ شاید ماضی بعید میں بھی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ بدلتی ہوئی بین الاقوامی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کے اسباب اور انکے نتائج سے کسی بھی حساس شاعر کا صرفِ نظر ممکن ہی نہیں، لہٰذا غضنفر کی تخلیقی سوچ نے نہ صرف اس صورتِ حال کا اثر قبول کیا بلکہ اپنی شاعری میں بھی اسے خوبصورتی سے پیش بھی کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں

گھر میں بیٹھے ہیں اور آنکھوں میں
عکس ٹھہرا ہے خوف و دہشت کا

سیاہی روز بڑھتی جارہی ہے
یہ کیسی روشنی پھیلی ہوئی ہے

اندھیرے میں اگر ہم چل سکے تو چل سکے ورنہ
ہمارے سامنے روشن کوئی رستہ نہیں ہو گا

www.urduchannel.in

آگے جانا بھی کٹھن پیچھے پلٹنا بھی محال
منتخب میں نے کیا جان کے رستہ ایسا

عجب صورت ہے خونی سلسلوں کی
زبانیں تھک گئیں ہیں خنجروں کی

خوف اور دہشت کے اس ماحول میں جینے پر مجبور لوگ، اپنے ملک سے ہجرت کرکے دیار غیر میں پناہیں ڈھونڈتے لوگ، اپنے لوگوں کو بلا سبب کھوتے لوگوں کا کرب ہمارے عہد کی ایک سنگین اور عبرتناک سچائی ہے، جسکا علاج بین الاقوامی برادری کے پاس بھی نہیں مگر غضنفر کو یہ احساس ہے کہ یہ سارا ماحول اور خون آلود فضا کے لئے چند لوگوں کا سیاسی اور معاشی مفاد ہے، جس کی نشاندہی اشارے کنایہ میں ہی سہی انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

مجمع تھا ، ڈگڈگی تھی ، مداری بھی تھا مگر
حیرت ہے پھر بھی کوئی تماشہ نہیں ہوا

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ غضنفر کی شاعری کا کینوس وسیع ہے، ان کی سوچ کئی دشاؤں میں سفر کرتی ہے، انہیں کئی اصناف سخن میں اظہار کا سلیقہ ہے، انہوں نے غزل کے علاوہ آزاد اور نثری نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے، اچھی نظمیں لکھنا میرے نزدیک خاصا مشکل کام ہے کہ اس میں جس طرح کے انہماک، ارتکاز اور ڈکشن کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں مگر مجھے خوشی ہے کہ غضنفر نے بعض کامیاب نظمیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ انہیں اس شعبے میں بھی خاسی دسترس حاصل ہے۔

نئے آدمی کا کنفیشن، ہجرت، میری آنکھ خالی ہے، وہ جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور لکھنو تیرا میرا زیاں وغیرہ ان کی کامیاب آزاد نظمیں ہیں، جن میں انہوں نے اپنی تخئیلی اور تخلیقی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے، اپنی سوچ اور وژن کو نئی دشاؤں میں روشن کیا ہے۔ نظم ہجرت میں انہوں نے تلاش رزق میں ہجرت اور حضور ﷺ کے زمانے میں اسلام کے پھیلاؤ کے لئے ہجرت میں فرق واضح کیا ہے جب کہ لکھنؤ تیرا میرا زیاں میں غضنفر نے اس خوبصورت شہر سے اپنی والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ خوابوں کے اس شہر کی لطافت، شیرینی، نغمگی اور خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے وہ جذباتی بھی ہوئے اور اس شہر کی ختم ہوتی ہوئی تہذیبی وراثت کو بیان کرکے غمگین بھی ہوئے۔ نثری نظموں کے باب میں بھی انہوں نے کئی کامیاب نظمیں لکھی ہیں، جس میں مہا بھارت سب سے مؤثر اور پاورفل ہے، اس نظم میں انہوں نے مہا بھارت کو استعارہ بناتے ہوئے عصری تناظر میں لادین اور افغانستان کے حوالے سے ایک نیا سیاسی منظر نامہ پیش کیا ہے، جس کے لئے وہ یقینی طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں، انہوں نے مختصر نثری نظمیں بھی اس کتاب میں شامل کی ہیں جو یقینی طور پر اپنے مظبوط مواد اور content کے لحاظ سے سنجیدگی سے پڑھے جانے کا مطالبہ کرتی ہیں، ان مختصر نثری نظموں کے موضوعات بھی موجودہ صورتِ حال سے عبارت ہیں، ایک نظم ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان ''ہم'' ہے

ہم ایسی جگہ رہتے ہیں
جہاں سبھی ہمارے لئے لڑتے ہیں
مگر عجیب بات ہے
کہ مرتے بھی ہمیں ہیں............(ہم)

ایک اور نظم شناخت بھی قابل توجہ ہے

www.urduchannel.in

ماں باپ نے ہماری شناخت
قائم نہ رکھی
کہ ہم بچ جائیں
مگر ان کے اسی عمل نے
ہماری جان لے لی
کہ ہمارے اپنے
ہمیں پہچان نہ سکے .... (نظم شناخت)

ان نظموں کا حجم اگرچہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع کے اعتبار سے ان نظموں کا پھیلاؤ بہت ہے اور ایک ایسی حقیقت کو بیان کرتا ہے جس سے انسانی برادری آج جوجھ رہی ہے اور اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اس طرح کی کئی نظمیں غضنفر کی زیرِ نظر کتاب آنکھ کی لکنت میں موجود ہیں جو ان کی تخلیقی ہنرمندی کا روشن ثبوت ہیں، انکی شاعری کے مطالعے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ انکی شاعری محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں اور نہ ہی منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہے بلکہ انہوں نے شاعری کے سفر میں سنجیدگی اختیار کی اور اس صنف کا حق ادا کر دیا اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اپنے افسانوں اور ناول کی طرح انہوں نے شاعری کو بھی وسیلۂ اظہار کی طرح اختیار کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب رہے ہیں ان کا شعری سفر جاری ہے لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آئندہ اس کتاب یعنی آنکھ میں لکنت سے آگے کا سفر طے کریں گے۔

☆☆☆

خالد جمال کی شاعری کا فکری اور تخلیقی نظام

خالد جمال میرے ہمعصر ہیں اور ایک عرصہ سے شاعری کر رہے ہیں۔ ان کا اولین شعری مجموعہ ''شریکِ حرف' ابھی حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ بعض لوگوں کے مطابق ان کے مجموعے کی اشاعت میں تاخیر ہوئی مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے شعری مجموعے کی اشاعت میں جلد بازی نہیں کی یعنی غیر شعوری طور پر اپنے تخلیقی وجدان کو اپنے جذب واحساس سے ہم آہنگ ہونے اور اپنی فکر کو فطری طور پر تخلیقی عمل سے گزرنے کے مواقع فراہم کیے، ورنہ ہماری نئی نسل کے شعراء کا عالم تو یہ ہے کہ محض دو چار برس کی شاعری کے بعد ہی اپنی کچی پکی اور ناپختہ غزلوں پر مشتمل شعری مجموعے کی اشاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں یعنی'' کاتا اور لے دوڑے'' کی طرز پر ایوانِ ادب میں اپنی موجودگی درج کرانے کی عجلت میں مصروف ہو جاتے ہیں اور پھر ناقدین ومبصرین سے مضامین اور تبصروں کے لئے مسلسل اصرار کرنے لگتے ہیں۔ خالد جمال ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں طور پر اپنی شناخت قائم کرنے والے تخلیق کار ہیں ان کے تخلیقی عمل میں زندگی سے مکالمہ کرنے کی جو تہذیب اور شعوری کاوش ہے وہ ہماری نسل کے بہت کم شعراء میں نظر آتی ہے، ان کے یہاں تخلیقی عمل میکانکی نہیں بلکہ فطری ہے، وہ ٹھہر ٹھہر کر شعر کہتے ہیں بلکہ شعر کے وارد ہونے کا مکمل

www.urduchannel.in

انتظار کرتے ہیں، جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی بہت کم گو اور سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔

شریکِ حرف میں اگرچہ کئی ناقدینِ شعروادب کی آرا شامل ہیں جن میں مختلف زاویوں سے ان کی شعری کائنات اور تخلیقی محرّکات نیز ان کی فکری نہج کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے مگر میرے نزدیک خالد جمال کی شاعری کو بغیر کسی ذہنی تحفظ اور نظریاتی عصبیت کے پڑھا جائے تو وہ کئی دشاؤں میں تہ بہ تہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ منعکس ہوتی ہے اور معنوی سطح پر حیرت وانبساط اور تجسس کے نئے نئے جہانوں کی سیر کراتی ہے۔ مجھے پروفیسر حامد کاشمیری کی اس رائے سے صدفی صد اتفاق کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کا رشتہ غزل کی روایت سے مربوط ہونے کے باوجود ذہن واحساس کی جدت پسندی پر دلالت کرتا ہے ان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ روایتی ترکیب واستعارہ سے کام لیتے ہوئے بھی اپنے شعری تجربات کو لفظوں میں پابند نہیں ہونے دیتے۔ میرے نزدیک یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صدیوں پر محیط غزل کی تہذیبی تاریخ اور وراثت میں تقریباً تمام تر مضامین باندھے جا چکے، یعنی اب اردو غزل میں کوئی نیا مضمون باندھنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے مگر اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی بھی مضمون کو نئے زاویے اور نئی تراکیب لفظی اور اپنے ڈکشن کے ساتھ نظم کر کے نیا پن تو پیدا کیا ہی جاسکتا ہے۔

خالد جمال کی شاعری کے مطالعے سے گزرتے ہوئے ہمیں کئی بار اس خوش گوار تجربے اور تحیر سے گزرنا پڑا کہ ان کے یہاں ڈکشن نیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ڈکشن ان کا اپنا وضع کردہ ہے، تراکیبِ لفظی ان کی اختراع کی ہوئی ہے اور کسی بھی کامیاب شاعری کے لئے یہ خصوصیات خاصی اہمیت رکھتی ہیں اور شاعر کی شناخت کا حوالہ بن جاتی ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ''شریک حرف'' کے مطالعے کے بعد چند اشعار نقل کرتا ہوں جن میں ان کی منفرد اور مخصوص تراکیب لفظی سے محظوظ ہوا جاسکتا ہے۔

خیالِ منصب و جاہ و حشم کی خیر کہ ہم
اٹھائے جانے کی ذلت سے بے ادب اٹھے

ہوائے تند فصیل ِ اماں گرا بھی گئی
جو ذرے خاک کے تھے خاکداں سے کب اٹھے

فریبِ رشتۂ جاں کے اثر سے نکلو تو
نظر نواز اشارے ہیں گھر سے نکلو تو

ہے کشت زار میں پھر فصلِ گل نمو آثار
غبار ِ ابر سے کہ دو کہ با ادب اٹھے

محوّلہ بالا اشعار میں خیالِ منصب و جاہ وحشم، ہوائے تند فصیلِ اماں، فریبِ رشتۂ جاں اور فصلِ گل نمو آثار وغیرہ ایسی ہی تخلیقی تراکیب لفظی ہیں جو ''شریکِ حرف'' کی شعری کائنات میں ایک وسیع اور معنی خیز استعاراتی نظامِ فکر کی تخلیق میں شریک ہیں جو شاعر کی مسلسل تخلیقی ریاضت اور مطالعے کے باب میں نمو آثار فصلِ گل کے نئے موسموں کی خوش آئند بشارت دیتی ہیں۔ خالد جمال کی شاعری کی تفہیم اور ان کے فکری وجدان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دراصل ہمیں ان کی شاعری میں استعمال ہونے والے ان استعارات تک رسائی حاصل کرنی ہوگی جو ان کی شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ ہر شاعر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے کچھ مخصوص الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو ہر بار ایک نئ معنویت کے ساتھ نمو پزیر ہوتے ہیں۔ خالد جمال کے یہاں بھی مجھے کچھ ایسے کلیدی الفاظ نظر آئے جوان

www.urduchannel.in

کی شاعری میں ایک وسیع تخلیقی کی فضا قائم کرتے ہیں۔سفر،سراب،ہجر،ریت،صحرا، مٹی،خواب،پانی،دریا،لہواورآسماں وغیرہ ایسے ہی ترجیحی الفاظ ہیں جو ان کے یہاں بار باراستعمال ہوتے ہیں جن کے بطن سے ہر بار معانی اور مفاہیم کا ایک خزانہ برآمد ہوتا ہےاوران کی داخلی کیفیات نیز شعری تجربات اور محسوسات کی تعبیر وتشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔چنداشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میں قطرۂ شبنم نہیں ، دریا بھی نہیں ہوں
اس چشمِ گہر بار سے برسا بھی نہیں ہوں

یہ زمیں میری بھی ہے یہ آسماں میرا بھی ہے
روز وشب کے کھیل میں سود وزیاں میرا بھی ہے

خاک سے خون کا رشتہ بھی عجب رشتہ ہے
ہم نے گوندھی ہوئی مٹی کا ترانہ لکھا

کس کو خبر تھی کتنی ہے صحرا کی تشنگی
دریا ہی سارا پی گیا اسباب چپ رہے

گئے دن کی کہانی ہی نہیں ہے
بہت ہے خون پانی ہی نہیں ہے

اٹھ کے مسمار ہی کردیں گے وہ دیوارِ فسوں
کوچۂ خواب سے اب کوئی صدا آنے دے

کچھ بھی مل جاتا سرِ راہ تو سر رکھ دیتے
اس کے شانے نہ سہی ریت کی دیوار سہی

ہجر موسم کو بھی زنجیر کیا ہے میں نے
قریۂ جاں میں ترے نام کے جگنو کی طرح

عرصۂ ہجر کی شب تاب شعاؤں سے جمال
گھر کی دہلیز میں کچھ روشنی کی ہے میں

خالد جمال کی شاعری میں حسن وعشق اور رومانی جذبات واحساسات کے اظہار کا انداز روایتی نہیں بلکہ جمالیاتی ہےاور یہ جمالیات ان کی شاعری میں زیریں لہر کے طور پر محسوس کی جاسکتی ہے،ان کے یہاں خاک اورخون کے درمیان ایک ایسے رشتے کی تلاش کا عمل شدید ہے جو ان کی شاعری میں عشق کا نیا محاورہ تخلیق کرنے میں محرک ہے جو ہجر موسم کو زنجیر کرنے اور ہجر کی شب تاب شعاؤں سے اپنی ذات میں روشنی بکھیرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ان کے یہاں عشق ایک وسیع تر معنوں میں زندگی کی مختلف سطحوں پر منعکس ہوتا ہے،خالد جمال کی شاعری میں جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی شاعری کا لہجہ ہے جو درویشانہ خود کلامی سے عبارت ہے،ان کا زیادہ تر شعری سفر بیرونِ ذات سے اندرونِ ذات کی طرف ہے اور خود آگہی اور خود آگاہی کے حوالے سے شاعری کا نیا منظر نامہ خلق کرتا ہے،برسوں کی تخلیقی ریاضت اور شعری مراقبے کے باوجود،نام ونمود کی خواہش کے بغیر خالد جمال نے نہایت انہماک اور ارتکاز سے اپنی شاعری اور زندگی کو ہم آہنگ کردیا ہے۔میرے نزدیک وہم وگمان سے ذات کے اثبات تک کے وسیع سفر میں خالد جمال

www.urduchannel.in

نے اپنی شاعری کو خاموشی سے کلام تک اور نفی سے اثبات تک پھیلا دیا ہے جس کے سبب ان کے یہاں موضوعات اور فکر کی سطح پر حیرت انگیز تنوع اور موجودہ صارفی معاشرے میں درپیش مصائل و مصائب سے نبرد آزما عام انسان کے شخصی تجربات اور محسوسات کو تخلیقی اکائیوں میں تبدیل کرنے کا قابلِ قدر جذبہ نظر آتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ خالد جمال کی شاعری کی تفہیم اتنی آسان بھی نہیں، بظاہر جتنی آسان ان کی شاعری نظر آتی ہے،ان کے فکری وجدان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان کی شاعری مکرّر قرأت کا مطالبہ اور تقاضہ کرتی ہے اور کئی بار کے مطالوں کے بعد میں نے ان کی شاعری کے حوالے سے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کی شاعری قاری کو ایک ایسے طلسم خانۂ معنی میں لے جاتی ہے جہاں قاری خود اپنے آپ سے نہ صرف مکالمہ کرنے لگتا ہے بلکہ اپنی ذات کے اندر سفر بھی کرنے لگتا ہے اور میرے نزدیک خالد جمال کی شاعری کی یہی انفرادیت انہیں اپنے بعض ہم عصر تخلیق کاروں کے مقابلے نمایاں اور ممتاز کرتی ہے۔

شریکِ حرف کے مطالعے کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ ان کے یہاں مختصر بحروں اور بہت کم لفظوں میں معانی و مفاہیم کے گل بوٹے سجانے کی ہنر مندی بدرجۂ اتم موجود ہے، حالانکہ یہ بات سچ ہے کہ بہت کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنا ایک مشکل کام ہے مگر خالد جمال نے یہ سب نہایت خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے کیا ہے اور اگر یہ سب ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے تب بھی قابلِ ستائش ہے۔ ان کی کئی غزلوں کے مصرعے تو محض تین چار لفظ پر ہی مشتمل ہیں مگر ان کی تخلیقی سوچ کو ادا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ کئی بار ایسا لگتا ہے کہ ان کی شدتِ فکر مختصر بحروں میں کہے گئے شعروں کے کنارے توڑ کر باہر نکلنا چاہتی ہے اور یہ ایک بڑی بات ہے۔

اپنی اس رائے کے ثبوت کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

لمحہ صدیوں پر بھاری
صدیاں ماہ و سال میں گم

ہر ایک ساعت جو بے اماں ہے
ہمارے ہونے کا اک نشاں ہے

دسترس میں سب کچھ ہے
اب مری ضرورت کیا

حیرتی ہے آئینہ
آئینے میں کیا روشن

آئینے کے اندر بھی
کوئی دوسرا سا ہے

دن کے ڈوب جاتے ہی
رات جگمگا اٹھی

اس نگاہ کا فسوں
لائق شمار ہے

ان اشعار میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ بہت کم الفاظ میں خالد جمال نے اپنی فکری اور تخلیقی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے اور غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے

www.urduchannel.in

مختصر بحروں کی غزلوں میں بھی اپنی فکر کی کہکشاں سجائی ہے۔ یہاں آئینہ ایک ایسا لفظ ہے جو ان کے یہاں ایک پاورفل استعارے کی طرح بار بار استعمال ہوتا ہے، آئینہ جہاں ایک طرف شاعر کا عکس دکھاتا ہے وہیں دوسری طرف معاشرے کو بھی اس کا عکس دکھاتا ہے اور خود حیرت میں ڈوب جاتا ہے اس کے علاوہ شاعر نے اس حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ کئی بار آئینے میں کسی دوسرے کا ہی عکس ہوتا ہے یعنی موجودہ معاشرے کا ایک کرب یہ بھی ہے کہ انسان کئی چہروں کے ساتھ زندگی کرنے کے عذاب سے گزر رہا ہے۔ کئی اشعار میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالد جمال اپنے اردگرد موجود اشیاء اور انسانوں کے نفسیاتی مشاہدے اور ان کے تجزیے سے بھی اپنی شاعری کے لئے خام مواد حاصل کرتے ہیں وہ اس اعتبار سے بھی لائقِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری کو محض خود کلامی تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے ذاتی غم کو بھی غمِ دوراں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ انہیں اپنے زخموں سے روشنی کشید کر کے، اپنے اردگرد پھیلے اندھیروں کو اجالنے کا ہنر بھی آتا ہے اور اپنے آنسوؤں سے آنکھوں کو منور کرنے کا سلیقہ بھی جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی ہمدردیوں کے دردمند شاعر ہیں اور اپنی پشت پر صدیوں پر محیط صحت مند انسانی قدروں کی بے مثال وراثت رکھتے ہیں جو غیر شعوری طور پر ان کی شاعری میں جابجا روشن نظر آتی ہے۔

ان کی شاعری کا اولین شعری مجموعہ ''شریکِ حرف'' بھی وسیع معنویت کا حامل ہے اور یہ محض الفاظ کا مرکب ہی نہیں بلکہ شاعر کے تخلیقی فکر و عمل اور شعری تہذیب کا اظہار یہ ہے جس کا ثبوت خالد جمال نے شریکِ حرف کی ترکیب کو اپنے کئی اشعار میں باندھ کر دیا ہے۔

خوش رنگ ساعتوں کا زیاں بھی زیاں نہیں
اب کے شریکِ حرف دعا آسماں نہیں

کسی میں بھی تو اتنا ظرف ہوتا
کہ وہ میرا شریکِ حرف ہوتا

اگر اسرار تیرے مجھ پہ کھلتے
تو میں تیرا شریکِ حرف ہوتا

ہمارا تذکرہ بے سود لیکن
شریکِ حرف تو، تُو بھی نہیں ہے

ان اشعار میں شریکِ حرف کے استعمال میں تکرار محض اتفاق نہیں ہے بظاہر یہ ایک مرکب لفظ ہے مگر اپنے اندر معنویت کی کئی سطحوں پر روشن ہوتا ہے یہ لفظ شاعر کے لاشعور کا حصّہ ہے اور ان کی شاعری میں containment ہم آہنگی اور زندگی کی مثبت قدروں کا استعارہ ہے۔ یہاں شاعر نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ منفی رویوں اور جذبوں کو شریکِ حرفِ دعا کرنے سے انسان اپنے ماضی کی خوش رنگ ساعتوں کے زیاں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود پر اسرارِ ذات کے منکشف ہونے کی صورت میں خود سپردگی اور خوش آہنگی کے جذبوں کی سرشاری سے ہم آغوش ہونے کی بشارت بھی دیتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ شریکِ حرف کی اشاعت میں تاخیر کا سبب کچھ بھی ہو یہ بات طے ہے کہ شریکِ حرف کی تخلیقی پزیرائی اور اعتراف میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی یعنی خالد جمال کی شاعری ناقدینِ شعر و ادب کو متوجہ کرنے میں کامیاب ٹھہرے گی۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

زندگی سے مکالمہ کرنے والا شاعر۔خوشبیر سنگھ شاد

خوشبیر سنگھ شاد موجودہ شعری منظر نامے پر نقش ایک ایسا نام ہے جس نے اپنی شاعری میں خوشگوار حیرتوں اور زندگی رنگ خوابوں کا ایک نیا ذائقہ تخلیق کیا ہے۔ان کی تخلیقی انفرادیت نے بہت کم عرصہ میں سرحدی اور جغرافیائی لکیروں کو مٹا کر عالمی سطح پر اپنی شناخت کے نئے موسم تحریر کئے ہیں اور کسی بھی شاعر کے لئے یہ ایک اعزاز کی بات ہے۔شاعری اگر حیرت کا دوسرا نام ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ خوشبیر سنگھ شاد کی شاعری ایک ایسا حیرت کدہ ہے جس میں ان کی سوچ کے مختلف رنگوں کے آئینے نصب ہیں اور جن میں ان کی فکر و شعور اور عصری آگہی کے رنگ برنگے عکس چمکتے نظر آتے ہیں۔

خوشبیر بیر سنگھ شاد کی شاعری سے میری ملاقات میرے جالندھر آنے سے عرصہ پہلے ہند و پاک کے موقر رسائل وجرائد کے حوالے سے ہو چکی تھی اور میں ان کی شاعری سے خاصا متاثر بھی تھا۔ملازمت کے سلسلے میں جالندھر آنے کے بعد ان سے

روبہ رو ملاقاتوں میں ان کی شخصیت کے ہفت رنگ پہلوؤں کے مطالعے کا شرف ملا جس میں وہ بے حد معصوم، کم گو مگر ملنسار، گمبھیر اور زندگی سے نہ صرف براہِ راست مکالمہ کرتے ہوئے محسوس ہوئے بلکہ اس میں اپنی مرضی کے رنگوں سے خوبصورت تصویروں کو مصور کرنے کے عمل میں بھی مصروف نظر آئے۔

زندگی میں تری تصویر مکمل کردوں
کاش مل جائے وہی رنگ جو بھرنا ہے مجھے

اگر یہ بات ہے جینا پڑے گا تیری شرطوں پر
تو پھر اے زندگی جینے سے ہم انکار کرتے ہیں

ایک طویل عرصہ تک لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد جالندھر میں کئی برسوں سے رہائش پزیر ہونے کے باوجود اب بھی ان کی شاعری میں بھی لکھنوی تہذیب وتمدن کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ترشا ہوا شگفتہ لہجہ، صاف ستھری زبان اور استعارات وعلائم کا خوبصورت استعمال، ان کی شاعری کو پراثر بنانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔بقول ڈاکٹر پیرزادہ قاسم ''سہل پسندی اور روایت کی نرمی تقلید سے انکاری خوشبیر سنگھ شاد نے شاید اپنے لئے مشکل راستہ چنا مگر اس کی سنجیدہ روی اور استقلال نے اس کی راہ آسان کردی ہے اور زندگی کے بارے میں اس کا رویہ زیادہ پر اعتماد ہوتا چلا گیا ہے۔'' یہ بات سچ ہے کہ خوشبیر سنگھ شاد کی شاعری کے یہاں فکری سطح پر سہل پسندی سے انحراف کا رویہ ملتا ہے، مگر اظہار کے لئے انہوں نے جو ڈکشن استعمال کیا ہے وہ سادہ اور شگفتہ ہے، ان کے یہاں تو شعر میں تہداری اور گہری معنویت کے لئے جو عوامل کارفرما ہیں وہ ان کے استعاراتی نظام سے فراہم ہوتے ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ کلیدی الفاظ ہوتے ہیں جو اس کے پورے تخلیقی عمل میں اس کے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے بار بار استعمال ہوتے ہیں اور

www.urduchannel.in

اس کی شاعری کا عمومی منظر نامہ خلق کرتے ہیں، اسی طرح خوشبیر سنگھ شاد کے یہاں بھی زندگی، آئینہ، خاموشی، وحشت، سرگوشی، خواب، زخم، تنہائی، دنیا اور شجر وغیرہ ایسے ہی الفاظ ہیں جو ان کی شعری اور تخلیقی دروں بینی میں ان کے ساتھ عملی طور پر سفر کرتے ہیں اور اظہارِ ذات کی ترسیل کے لئے راہیں بھی ہموار کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

زخم ہوں میں تم کہاں سمجھوگے میری کیفیت
کن مراحل سے میں گزرا ہوں نشاں ہونے تلک

نہ جانے کتنی اذیت سے خود گزرتا ہے
یہ زخم تب کہیں جاکر نشاں بناتا ہے

شاد یہ ماضی سے لے کر حال تک کا ہے سفر
زخم کو برسوں لگے ہیں اک نشاں ہوتے ہوئے

کہا یہ درد نے مجھ سے نظر ملا تو سہی
تو شاد ہو تو گیا زخم کو نشاں کر کے

ذرا سی بات پر شاخوں سے برہم ہوگئے پتے
ہوا تو کب سے تھی ان کو جدا کرنے کی کوشش میں

جواں بچّوں کی اپنی زندگی ہے ان سے کیا شکوہ
جدا ہوتے ہیں کیا پتے شجر سے مشورہ کر کے

پھر بھیگی آنکھوں سے دیکھا پیڑ نے اپنی شاخوں کو
آج بھی تھے کچھ سوکھے پتے گرنے کی تیاری میں

کون سمجھے گا کہ خود کو کس طرح یکجا کیا
وقت نے جب منتشر خوابوں کا شیرازہ کیا

مرے بکھرے ہوئے ذرات کا احسان ہے مجھ پر
اگر یہ دیکھنے والوں کو لگتا ہے کہ یکجا ہوں

ہمارے ظرف پر حیران تو ہوگا یہ صحرا بھی
بکھر کر، خود کو ہم یکجا نہ جانے کیسے کرتے ہیں

جدید شاعر کے یہاں تنہائی اور بکھراؤ کے برعکس شاد کی شاعری میں خود کو یکجا کرنے اور اپنی تنہائی کے غم سے قوتِ نمو حاصل کرنے کا عمل شدید ہے جو یقینی طور پر ان کی شاعری میں زندگی کی مثبت قدروں کے اظہار کا وسیلہ ہے، یوں تو ان کی شاعری کے کئی رنگ ہیں، کئی چہرے ہیں جو بار بار ان کی تخلیقی سوچ کا حصہ بنتے ہیں مگر ان کے یہاں اپنے زخموں سے روشنی کشید کر کے درونِ ذات کو روشن کرنے کا رویہ زیادہ اہم ہے۔ محولہ بالا اشعار میں زخم اور اس کے بھر جانے کے بعد باقی رہ جانے والا نشان ان کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں محفوظ ہے اور کئی زاویوں سے ان کے کئی شعر میں بار بار رقم ہوا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ماضی کا کوئی تلخ تجربہ، کوئی تلخ یاد یا اپنوں کے ذریعہ دیا جانے والا فریب، زخم کی صورت شاعر کے ذہن و دل پر مرتسم ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ان زخموں کے بھر جانے کے باوجود، ان زخموں کے نشان کی صورت ایک کسک رہ جاتی ہے۔ کئی اشعار میں اس طرح کے خیال کی تکرار اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر

www.urduchannel.in

خود ذاتی طور پر ان تلخ تجربات سے عملی طور پر ہم کنار ہوا ہے۔اسی طرح ایک اور تجربہ کہ پتے سوکھنے کے بعد شاخ سے جدا ہو جاتے ہیں، بظاہر یہ ایک فطری اور سائنٹفک عمل ہے مگر اس خیال کو خوشبیر سنگھ شاد نے کمالِ ہنرمندی سے موجودہ معاشرے کے المیے کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو اپنے والدین یا گھر سے جدا ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ایک فطری عمل ہے۔یہاں پیڑ اور پتے کو علامتی طور پر بالترتیب والدین اور بچے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح خوشبیر سنگھ شاد کے یہاں ذات کے بکھراؤ اور انتشار کو نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بنایا گیا ہے۔موجودہ عہد میں فرد اور معاشرے کے درمیان گم ہوتے ہوئے رشتوں اور اعتماد کو بکھراؤ اور انتشار کی مدد سے مصوّر کیا گیا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ شاد ایک خاموش طبیعت اور گمبھیر انسان ہیں لہٰذا یہ بات قرین از قیاس بھی ہے کہ ان کا سارا سفر ظاہر سے باطن کی طرف ہے اور وہ اپنے اس سفر میں ایک طرح کی سرشاری اور انبساط سے نہ صرف لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ اپنے اس روحانی سفر کے تجربات کو اپنے شعری عمل کا حصّہ بھی بناتے ہیں۔بقول فرحت احساس ''خوش بیر کو قریب سے دیکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھ پر ان کی گم شدگی اور دنیا گریزی ظاہر ہو گئی ورنہ ممکن تھا کہ انہیں مشاعروں میں آتا جاتا دیکھ کر ان کے بارے میں کچھ اور فرض کر لیتا جو بلا شبہ غلط ہوتا'' یہ بات سچ ہے کہ خوشبیر سنگھ شاد کی شاعری میں ایک طرح کی گمشدگی اور دنیا گریزی کا احساس ہوتا ہے مگر میرے نزدیک یہ اس وقت ہی ہوتا ہے جب وہ اپنی ذات کے سمندر میں ڈوب کر فکر و احساس کے موتی تلاشنے میں مصروف ہوتے ہیں اور ان کی دروں بینی کا یہ عمل اس اعتبار سے بھی ضروری ہے کہ یہی ان کے تخلیقی کرب سے نجات کا وسیلہ بھی ہے اور شاید اسی لئے انہوں نے کہا ہے کہ۔

سکوتِ شب میں جو یہ شاد میں خاموش بیٹھا ہوں
لگا ہوں خامشی کو ہم نوا کرنے کی کوشش میں

خوشبیر سنگھ شاد کی شاعری میں میرے نزدیک دنیا گریزی کے عمل سے زیادہ دنیا کو اپنے طور پر برتنے اور اس سے لاپروائی کا رویہ زیادہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔شہاب جعفری کی طرح وہ دنیا کو حقیر نہیں سمجھتے مگر دنیا کو بہت زیادہ اہمیت دینے کے حق میں بھی نہیں نظر آتے بلکہ کبھی کبھی دنیا سے مفاہمت کی صورت بھی پیدا کر لیتے ہیں۔

غلط کیا تھا اگر اس شور کا حصّہ نہیں تھا میں
مری خاموشیوں کا تجزیہ اب خود کرے دنیا

اسے کہہ دو کہ میں جس مرحلے پر ہوں وہیں خوش ہوں
اب اپنی سمت خود طے کر لے اور چلتی رہے دنیا

اب اسی دنیا سے آخر کام مجھ کو پڑ گیا
ایک مدّت تک رہی جو میری ٹھکرائی ہوئی

خوشبیر سنگھ شاد کے یہاں شاعری محض تفننِ طبع کا سامان نہیں بلکہ فکری اور تخلیقی کرب سے نجات کا وسیلہ ہے،ان کی شاعری کا معنوی کینوس بہت وسیع ہے،یہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں بہت سارے عکس بیک وقت منعکس ہوتے ہیں،ان کے یہاں حزن و ملال کی کیفیت بھی ہے اور مسرت اور شادمانی بھی،خاموشی بھی ہے گویائی بھی،اثبات بھی ہے اور انحراف بھی محفل بھی ہے اور تنہائی بھی اور یہی وہ ساری خصوصیات ہیں جو ان کی شاعری کو مختلف جہتوں میں روشن کرتی ہیں اور اپنے تمام تر کمال و جمال اور سرشاری کے ساتھ نئے ذائقوں اور فکر و احساس کے نئے موسموں سے رُوشناس کراتی ہیں اور قاری کو اپنے ساتھ نئے جہانِ معنی کی سیر پر آمادہ کرتی ہے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

ایک آنسو کہ جو آنکھوں کو منوّر کر دے

یہ بات سچ ہے کہ مدھیہ پردیش کے شعری افق پر اپنی پوری تخلیقی آب وتاب کے جگمگانے والا ستارہ گذشتہ دنوں ڈوب گیا مگر اس حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ شاہد میر ہندوستان کے موجودہ ادبی منظر نامے پر بہت دنوں تک روشن رہیں گے۔ اپنے مدھر لہجے اور فکری سادگی اور شگفتگی کے سبب شاہد میر شاعری کی مروّجہ گرامر سے الگ اپنے اسلوب اور لب ولہجہ دریافت کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور یہ ایک ایسی کامیابی ہے جو ہر کسی کے حصہّ میں نہیں آتی۔

شاہد میر ذاتی طور پر بے حد مخلص، سادہ اور ملن سار تھے ان سے ملاقات کے دوران مجھے کبھی بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا ان کی یہ خصوصیت ان کی شاعری میں بھی جابجا محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے مگر اردو دوہوں سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''موسم زرد گلابوں کا'' سے لے کر ''ریگِ رواں'' تک ان کی تخلیقی سوچ کی ایک کہکشاں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''دوہے عالم گیر'' کے عنوان سے دنیا بھر کے دوہوں کا انتخاب بھی شائع کیا ہے، جسے ایوانِ ادب میں غیر معمولی پزیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس انتخاب کی اہمیت اس لئے بھی ہے کیونکہ اردو میں بتدریج مقبول ہوتی ہندی کی اس صنف سخن کا یہ ایک ایسا انتخاب ہے جس میں اردو میں

مقبول ہوتے دوہوں کی سمت ورفتار کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

شاہد میر کے بارے میں یہ معلومات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ انہیں موسیقی اور راگ راگنیوں کا گیان بھی بہت تھا، اور اپنے اس علم کو انھوں نے اردو شاعری میں بھی بخوبی استعمال کیا ہے۔ چونکہ دوہا ہندی کی ایک لوک صنف ہے لہٰذا موسیقی اور دوہے ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں اسی لئے اندازہ ہوتا ہے کہ دوہوں سے شاہد میر کی قربت فطری ہے۔ دوہے کے بارے میں اپنی کتاب دوہے عالم گیر میں اپنی رائے کا اظہار شاہد میر اس طرح کرتے ہیں۔

''دوہا اور غزل اپنے اندر اظہار کی وسعتوں کو نہایت ہی مختصر انداز میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دو مصرعے اور ساری کائنات کا احیاء یہی غزل کے شعر اور دوہے کی خصوصیت ہے جس کی جانب آج کا انسان مبذول ہوتا ہے۔ سارے دن کے تھکے ہوئے پرش کے لئے دوہا وہ capsule فراہم کرتا ہے جس میں تازگی اور تشفی، کھرا پن اور رنگینی، حقیقت اور کہانی بیک وقت موجود رہتے ہیں۔''

شاہد میر کی غزل ایک ایسا نگارخانہ ہے جس میں ہم اپنے عہد کا چہرہ کئی زاویوں سے دیکھ سکتے ہیں، ان کا لہجہ دھیما اور مدھر ہے، کسی صاف شفاف پہاڑی جھرنے کی طرح۔ ان کی زیادہ تر غزلیں مترنم اور شگفتہ ہیں، ان کی کئی غزلوں کو ملک کے معروف ومقبول گلوکاروں نے آواز دی ہے، ان کے اشعار سادہ ہیں مگر ان میں اثر آفرینی کی وہ کیفیت ہے جو قاری اور سامع دونوں کو ایک نئے جہانِ معنی کی نہ صرف سیر کراتے ہیں بلکہ ایک طرح کی کیفیت اور سرشاری سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت انہیں اپنے بہت سارے ہم عصر شعراء کے مقابلے ممتاز ہی نہیں منفرد بھی بناتی ہے۔ حالانکہ مدھیہ پردیش کے اس البیلے شاعر کو self projection کا ہنر نہیں آتا مگر یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ ملک کے معتبر ناقدینِ شعروادب نے شاہد میر کی شاعری کے بارے میں خوش آئند بشارتیں دی ہیں۔

www.urduchannel.in

میرے نزدیک شاہد میر نئے تخلیقی تجربوں اور مشاہدات کے حساس شاعر ہیں ،انہیں آنسوؤں سے آنکھوں کو منوّر کرنے کا ہنر بھی آتا ہے اور زخموں سے روشنی کشید کرنے کا عمل بھی ان کے یہاں شدید ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شاہد میر نے اپنی شاعری میں اپنے جذبۂ وفکر اور وجدان کے اظہار کے لئے زبان کی شگفتگی ،سادگی اور شائستگی کا التزام یقینی بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دل لبھاتے ہوئے خوابوں سے کہیں بہتر ہے
ایک آنسو کہ جو آنکھوں کو منوّر کردے

گل نہیں تو باغ کے پتّے اڑا لے جائے گی
کوئی پہلو ڈھونڈ ہی لے گی ہوا تذلیل کا

جسم ہے میرا اک گھنا جنگل
اے پرندے بنا لے گھر مجھ میں

اصول فلسفے ذرا ہوں کم تو کچھ دکھائی دے
کھڑا ہوا ہے دیر سے پسِ غبار آدمی

یقیں کے لفظ گماں ساتھ لے کے آئے ہیں
چراغ اپنا دھواں ساتھ لے کے آئے ہیں

دوست، دفتر، چائے خانے سب بچھڑتے جا رہے ہیں
رات سر پہ آگئی ہے اور مجھے گھر ڈھونڈنا ہے

شاہد میر کے محوّلہ بالا اشعار جنہیں میں نے ان کے مجموعے سے سرسری طور پر گزرتے ہوئے منتخب کئے ہیں دراصل موجودہ عہد میں فرد اور معاشرے کے درمیان ٹوٹتے ہوئے رشتوں، ذات کی تنہائی، گماں گزیدہ آدمی کی بے زاری، بے یقینی اور مسلسل جدو جہد کے باوجود انسان کی محرومی اور نا آسودگی کے کرب کا اظہار ہیں جو موجودہ عہد کی تیز رفتار زندگی میں عام آدمی کا مقدّر ہیں مگر ان مسائل ومصائب کے اظہار میں شاہد میر فیشن گزیدہ جدیدیوں کی طرح یکسانیت کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اپنے مخصوص طرز اظہار کو ہی اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنایا ہے۔

بظاہر اس طرح کے احساسات عام جدید شاعری کے طے شدہ موضوعات ہیں مگر انہیں شاہد میر نے اپنے اشعار میں تخلیقی ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک اچھی شاعری بس اچھی شاعری ہوتی ہے اسے کسی بھی طرح کی نظریاتی وابستگی یا ازم سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے شاہد میر قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنی شاعری کو زندگی کا ایک ایسا آئینہ خانہ بنا دیا ہے جس میں کئی زاویوں سے معاشرے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ ہر اچھا اور جینوئن شاعر اپنا ڈکشن خود دریافت کرتا ہے یا پھر یوں کہا جائے کہ اچھا اور بڑا شعر اپنی لفظیات خود ساتھ لے کے آتا ہے اس اعتبار سے دیکھیں تو شاہد میر کے یہاں بھی ایسے کئی سارے لفظ بار بار روشن ہوتے ہیں جوان کے شعری اظہارات کو نئی دشاؤں میں روشن کرتے ہیں۔ خواب، دریا، دشت، پیڑ، پرندے، گھر، درخت، پانی، جنگل اور صحرا وغیرہ ایسے ہی الفاظ ہیں جو اُن کی شاعری میں کلیدی استعارات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے اشعار کو پرت در پرت نئی معنوی

www.urduchannel.in

دشاؤں میں منعکس کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

یارو آخرکار اکیلے رہ جاؤ گے
گذرے کل سے کچھ تو سیکھو! خواب نہ دیکھو

جنگل بستی صحرا دیکھو خواب نہ دیکھو
خواب سراب صفت ہیں لوگو خواب نہ دیکھو

کچھ نہ کچھ بنیاد ہے سیرابیوں کے خواب کی
ریت کی تہ میں کہیں تھوڑا سا جل موجود ہے

چھوڑ کر گھر بار نکلا ہے تو شاہدؔ چل اکیلا
پار کرنا ہے دکھوں کا بیکراں جنگل اکیلا

میرے اندر خواہشوں کے ناگ پھن پھیلا رہے ہیں
دور جنگل میں مہکتا ہے کہیں صندل اکیلا

وہی سفاک ہواؤں کا ہدف بنتے ہیں
جن درختوں کا نکلتا ہوا قد ہوتا ہے

ہوئے ہیں سرنگوں سارے ہرے پرچم درختوں پر
ہوا شاید رہی ہے دیر تک برہم درختوں پر

محولہ بالا اشعار میں شاہد میر کے فکری تنوع اور اظہار کے متعدد زاویوں کا احساس ہوتا ہے، وہ اپنے غم وغصہ اور جذبوں کی شدت کا اظہار بھی نہایت دھیمے اور شائستہ لہجے میں مہذب طریقے سے کرتے ہیں، اور یہی تہذیبی رکھ رکھاؤ اور التزام ان کی پوری شاعری میں نظر آتا ہے۔ شاہد میر کی شاعری کے مطالعے کے دوران مجھے کئی ایسی غزلیں بھی نظر سے گزریں جن میں ردیف کے طور پر لفظ ''پانی'' کا استعمال ہوا ہے، پانی کے استعارے کا تخلیق استعمال ان کی سنجیدہ فکری نہج کی علامت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، پانی جو زندگی کا استعارہ ہے، پانی جو گہرائی اور گیرائی کا استعارہ ہے ،شاہد میر کی شاعری کو ایک بالکل نئی فضا اور معنوی سطح پر نئے جہانِ فکر سے ہم کنار کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اتر چکا ہے گھٹاؤں کا تاؤ پانی میں
نہیں چلے گی یہ کاغذ کی ناؤ پانی میں

بچے ہوئے ہیں مرے چشمِ تر میں خواب ابھی
سلگ رہے ہیں مسلسل الاؤ پانی میں

آنکھوں میں جتنے آنسو تھے خشک ہوئے
قحط ہے اب کے دریا دریا پانی میں

ہے موج موج رواں اندرون پانی کا
بتا رہا ہے مسلسل سکون پانی کا

شاہد میر کی شاعری فکر و اظہار کی سطح پر کثیر الجہت ہے ان کے یہاں تخلیقی سوچ

www.urduchannel.in

کا دائرہ محسوسات سے لے کر مشاہدات تک پھیلا ہوا ہے۔اظہار کی سطح پر بھی ان کے یہاں تنوع ہے،انفرادیت ہے نیز اپنا لہجہ تراشنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔

شاہد میر کی شاعری کی تفہیم کے لئے ان کے ہم عصر،ہم وطن اور دوست ڈاکٹر خالد محمود کی یہ رائے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

’’ شاہد میر جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے اچھے انسان بھی ہیں، حالانکہ ان دونوں صفات کا ملن کوئی ضروری نہیں۔خیالات کی پاکیزگی،فکر کی بلندی،جذبے کی لطافت اسکے اشعار کی غذا ہیں۔تجربات ومشاہدات کی وسعت،نگاہ کی بلندی،فکر کی گہرائی اور فن کی تازہ کاری نے اشعار کی دل نوازی میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔‘‘

شاہد میر اور ڈاکٹر خالد محمود دونوں کا تعلق سرونج کی سرزمین سے ہے، چونکہ شاہد میر نے ایک عرصہ بھوپال میں گزارا ہے اور ان کی شاعری کا ایک قابلِ ذکر حصہّ بھوپال کی مٹی سے نمو پزیر ہوا ہے لہٰذا ان کی شاعری میں بھوپال کا ذکر اور اس کی مٹی سے ذہنی اور جذباتی وابستگی کا اظہار بھی نمایاں طور پر ہوا ہے۔

چھوڑ کر جاؤ گے بھوپال کہاں اے شاہد
اس کی مٹی سے تو آتی ہے وطن کی خوشبو

ہم تشنہ لبوں کو پھیلا ہوا اک تال دکھائی دیتا ہے
جب ہوتی ہیں آنکھیں بند کبھی بھوپال دکھائی دیتا ہے

☆☆☆

کبیر اجمل۔خوشگوار حیرتوں کا شاعر

گذشتہ دنوں بنارس میں ایک مختصر سی ملاقات کے دوران نوجوان شاعر کبیر اجمل نے جب مجھے اپنا شعری مجموعہ ’’منتشر لمحوں کا نور‘‘ عنایت کیا تو پہلی نظر میں ہی کتاب نے مجھے اپنے گیٹ اپ اور ظاہری خوبصورتی کے سبب دیدہ زیب لگی۔اِدھر اُدھر سے ورق گردانی کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ کبیر اجمل ایک تازہ کار اور نئے امکانات کے حامل تخلیق کار ہیں۔

کبیر اجمل سے میری واقفیت ،شب خون میں شائع ہونے والی انکی غزلوں کے حوالے سے پہلے ہی ہو چکی تھی ،لہٰذا ان سے مل کر اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوا، ادبی گفتگو کے دوران میں نے انہیں نہایت سنجیدہ،متین اور پرخلوص پایا۔سراپا اخلاق اور انکسار کا پیکر، دھیمے لہجے میں سوچ سمجھ کر گفتگو کرنے والے کبیر اجمل کے یہاں شاعری محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ داخلی جذبوں کے احترام اور اظہار کا موثر وسیلہ ہے،ٹھہر ٹھہر کر شعر کہنے کی سرشاری اور اپنی ذات کو کائنات اور خارجی عوامل کے مطالعے اور مشاہدے کا ہنر کبیر اجمل کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

’’ منتشر لمحوں کا نور‘‘ کی شاعری پر گفتگو کرنے سے پہلے ،اس پر ڈاکٹر یعقوب یاور کے دیباچے سے کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں کہ میرے نزدیک یہی ذریعہ ہے

www.urduchannel.in

کبیر اجمل کے شعری کائنات کی تفہیم وتعبیر کا۔

''کبیر اجمل کے شعری لب و لہجے میں تازگی ہے،انکا ذہن اپنے عہد کا مناسب ادراک رکھتا ہے......انہوں نے غزل میں ایمائیت کے ساتھ ساتھ اظہار کا وہ مخصوص وسیلہ دریافت کرلیا ہے جسے پراسراریت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جہاں بڑے بڑوں کی رسائی ممکن نہیں ہو پاتی......کبیر اجمل کی شاعری کا غالب لہجہ غم سے عبارت ہے۔ لیکن صرف اتنا کہہ دینے سے بات نہیں بنتی کیونکہ غم کا اظہار اب محض سنجیدہ اور معتبر شاعروں کی میراث نہیں رہ گیا ہے......عریانیت کے اس دور میں انہوں نے نہ صرف اپنے لہجے میں شائستگی کا خیال رکھا ہے بلکہ الفاظ کے استعمال میں بھی محتاط رہے ہیں......''

ڈاکٹر یعقوب یاور نے کبیر اجمل کی شاعری کے حوالے سے جو باتیں کہی ہیں ان میں اپنے فکری رجحانات، انکے مخصوص لہجے اور اسلوب کے پر گفتگو کی گئی ہے مگر میرے نزدیک کبیر اجمل ان سارے عوامل سے آگے کا شاعر ہے اور اس کی شاعری کو ایک بڑے کینوس اور وسیع تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔کبیر اجمل کا وژن اسکی اپنی سوچ سے بھی بہت آگے ہے ان کی تخلیقی فکر کئی دشاؤں میں منعکس ہوتی ہے جو یقینی طور پر کئی سطحوں پر روشن ہوتی ہے جنہیں انکے کئی اشعار میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مجھے کبیر اجمل کی شاعری کو کئی زاویوں سے پڑھنے کا موقع ملا اور میں لطف اندوز بھی ہوا انکی کثیر الجہت تخئیلی اور تخلیقی صلاحیتوں سے۔ان کی شاعری میں گہری فکر اور تازگی ہے جو قطعی طور پر غیر شعوری اور غیر ارادی ہے ان کے وسیع مطالعے کی چھاپ جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ان کے اظہار اور اسلوب میں ندرت ہے جو اضطراری نہیں بلکہ وہبی ہے اور جو سب سے اہم بات ان کی شاعری میں مجھے نظر آتی ہے وہ یہ کہ انکے یہاں داخلی فکر کا سیال تیز بہاؤ کے ساتھ آتا ہے اور بہت شدید ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اظہار کے مروجہ اصولوں سے بغاوت، انحراف اور توڑ پھوڑ کا احساس بھی ہوتا ہے

ان کی شاعری میں مشکل زمینیں اور فارسی تراکیب اور مرکب اضافتِ لفظی کے سہارے ہی اتنے شدید فکری سیلاب کو باندھا جا سکتا ہے۔ان کی شاعری میں اس خوبصورت صورتِ حال کا اعتراف شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کیا ہے جو یقینی طور پر سند کا درجہ رکھتا ہے۔کبیر اجمل نے فارسی تراکیب اور اضافتوں کے ذریعہ اپنا منفرد علاماتی نظام از خود وضع کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں ۔غبارِ دشتِ طلب، ریگزارِ لب جو، دروازہء اثبات ونفی، ساکنانِ شہرِ رفاقت، شمارِ شکستِ خواب، نہاں خانۂ صد چاک، تپشِ موسمِ انا، اور کثافتِ عمرِ رواں وغیرہ ایسی اضافتی تراکیب ہیں جو کبیر اجمل کی فکری بصیرت اور معنویت کو نئی دشاؤں میں روشن کرتی ہیں اور ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہیں۔

کبیر اجمل نے اپنے اولین شعری مجموعے کا نام ''منتشر لمحوں کا نور'' رکھا ہے جو معنوی اور علامتی ہر دو لحاظ سے بے حد معنی خیز اور فکر انگیز ہے، منتشر یعنی بکھرے ہوئے لمحوں سے نور کشید کرنے کا عمل ہی دراصل کبیر اجمل کے یہاں تخلیقی عمل سے عبارت ہے اور میرے نزدیک بالکل ویسا ہی ہے جیسے کسی بھی ذرّے (particle) کو ممکنہ حد تک چھوٹے چھوٹے ذرّات میں توڑتے چلے جائیں تو ان میں سے بڑی پاور فل انرجی یا توانائی کا اخراج ہوتا ہے، لمحہ جو وقت کی اکائی ہے، اس کے انتشار سے روشنی کا اخراج کبیر اجمل کو پاور فل تخلیقی توانائی عطا کرتا ہے۔

کبیر اجمل کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نجیب رامش (مرحوم) نے لکھا ہے کہ وہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا شاعر ہے بلکہ جدیدیت سے مابعد جدیدیت کی طرف رواں ہے، مجھے اس سے اختلاف ہے اور اس لئے کہ اچھی اور سچی شاعری کے لئے شاعر کا کسی بھی تحریک یا رجحان سے منسلک ہونا ضروری نہیں بلکہ ہمارے ناقدینِ شعر و ادب اپنی سہولت کے لئے شاعروں کو ان خانوں میں فٹ کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ کبیر اجمل ایک بڑے کینوس کے شاعر

www.urduchannel.in

ہیں اور انہیں ادب میں کسی بھی نظریاتی وابستگی سے جوڑ کر دیکھنا انکی شاعری کے ساتھ نا انصافی ہوگی، ان کی شاعری محسوسات، مشاہدات اور تجربات و مراقبے کی شاعری ہے انہیں اپنے غم سے حوصلہ ملتا ہے، ہجر سے وصل کے مہتاب عطا ہوتے ہیں، انہیں اپنے زخموں سے روشنی کشید کر کے اظہار کی نئی عبارتیں لکھنے کا ہنر خوب آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں ،ان کے یہاں ہجر، وصل، خواب، خاک پرندہ، شام، سمندر، انا اور لہو جیسے الفاظ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تخلیقی آگہی کو نیا وژن عطا کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

وہی ہے ذائقۂ آب وگل لہو جیسا
وہی فضا وہی ابرِ غم کشادہ بھی

نہ جانے خاک سے اب کیا سخن کرے یہ ہوا
لہو نے نوکِ مژہ پر کمند ڈالی ہے

سمندر بھی پکارے گا مری تشنہ لبی کو
ابھی اک سلسلہ خاک و لہو کا رقص میں ہے

کس نے کہا وجود مرا خاک ہو گیا
میرا لہو تو آپ کی پوشاک ہو گیا

لہو بے رنگ کرنے کی عجب تحریک تھی وہ
عجب یہ بھی کہ ہم نے استفادہ کر لیا ہے

لہو سے پیاس بجھاتے ہیں لوگ شہروں میں
سروں کی فصل بھی اگتی رہی ہے کھیتوں میں

ہم اہلِ ہجر شکستِ سوادِ شام کے بعد
عذاب آیا تو تیری طرف ہی آئیں گے

ہم ہیں کہ اسی خاک کی جاگیر ہیں ورنہ
چاہیں تو ابھی وسعتِ افلاک بھی دیکھ آئیں

خاک کو خون سے ہم رنگ کیا ہے اجمل
اپنے ہونے کا یہی ایک سبب آخری ہے

ان اشعار میں خاک اور لہو دوایسے استعارے میں جو کبیر اجمل کی شعری اور تخلیقی کائنات کو بے حد وسیع ،معنی خیز اور فکر انگیز بناتے ہیں ۔لہو زندگی کی علامت ہے، حرکت و عمل کا استعارہ ہے، انا اور خودداری سے عبارت ہے، جبکہ خاک سکوت ، بے یقینی ، پژمردگی ،موت اور بے عملی کی علامت ہے۔ منتشر لمحوں کا نور میں ایسے بہت سارے اشعار مل جائیں گے جن میں خاک اور خون کی علامتیں شاعر کی فکری جہتوں اور اسلوبیاتی نظام کی رنگا رنگی کے درمیان ایک وسیع جہانِ معنی خلق کرتی ہیں اور کبیر اجمل کی شاعری کو نئے عہد کی تخلیقیت سے ہم رنگ و ہم آمیز کرتی ہیں، دراصل خاک اور خون کو ہم رنگ کرنے کا عمل ہی انکی شاعری کو عمودی اور مسلسل ارتقا پزیر بناتی ہیں۔
شمیم طارق نے کبیر اجمل کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منتشر لمحوں کا نور انکے عقیدہ و خیال، شعور و لاشعور، اور مذہب و ادب کو ہم رشتہ کرنے والا ایک دریچہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ شمیم طارق کی اس رائے کو وسیع تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے،

www.urduchannel.in

کیونکہ کبیر اجمل کی شعری سوچ کا کینوس اور انکے تجربات و مشاہدات کا دائرہ انسانی زندگی کے ان پہلوؤں تک پھیلا ہوا ہے، جہاں ان کے بعض ہم عصروں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔

یہ بات سچ ہے کہ کبیر اجمل نے اپنے تخلیقی تجربات کے اظہار اور اسلوب میں شائستگی کا خیال رکھا ہے اور ان کے یہاں رومانی احساسات و جذبات کے اظہار میں بھی ایک طرح کی خوش سلیقگی اور ہنر مندی نظر آتی ہے جو مجھ ایسے بہت سارے ادب کے طالب علموں کے لئے ایک خوش گوار تجربہ ہی ہے، جسم و جاں کے کھیل میں بیباک ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ہجر و وصل اور وارداتِ قلبی کے اظہار میں اپنی تمام تر تخلیقی سلیقہ مندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

سرد جذبوں کی کسک جب گفتگو میں پھیل جائے
درمیاں اک چپ سی گونجے اور لہو میں پھیل جائے

اس ایک شامِ تحیر کا لمسِ دل آویز
رگوں میں پھیل رہا ہے بدن سوالی ہے

لے کے پہنچی ہے کہاں سیم بدن کی خواہش
کچھ علاقہ نہ رہا سود و زیاں سے آگے

ازل سے زرد بگولوں کا رقص جاری ہے
وہ قطرہ قطرہ سرابِ بدن میں آئے کبھی

ان اشعار میں کبیر اجمل نے اگرچہ براہِ راست کسی جنسی جذبات کا اظہار نہیں کیا ہے مگر غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سرد جذبوں کی کسک، چپ کا گونجنا اور لہو میں پھیل جانا، شامِ تحیر کے لمس دل آویز کا رگوں میں پھیلنا اور بدن کا سوالی ہونا، سیم بدن کی خواہش کے درمیان سود و زیاں سے کوئی علاقہ نہ ہونا، زرد بگولوں کا رقص اور بدن کے سراب میں قطرہ قطرہ آنا، یہ ساری علامتیں اور اشارات انسان کی جنسی اور جبلی خواہشوں اور انکی آسودگی اور نا آسودگی کو ہی بیان کرتے ہیں مگر اس سلیقے اور تہذیبی ہنر مندی کے ساتھ کہ کہیں بھی قاری کی سنجیدہ ساعت پر گراں نہیں گزرتا۔ یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ کبیر اجمل کے یہاں اس طرح کے موضوعات غیر شعوری طور پر ہی انکی تخلیقی سوچ کا حصہ بنتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں اشعار کی تعداد پانچ۔ سات سے زیادہ نہیں اور بعض غزلیں تو محض تین یا چار شعروں پر ہی مشتمل ہیں، ان کے یہاں تخلیقی عمل میکانکی نہیں بلکہ فطری ہے۔

کبیر اجمل کی شعری فضا غیر مانوس ہے، انکے یہاں بعض الفاظ و تراکیب بھی غیر مانوس ہیں اور عام قاری کے لئے تفہیم و تعبیر کا مسئلہ بھی پیدا کر سکتے ہیں مگر ان کے اشعار ترسیل کے المیے کا شکار نہیں، بلکہ اپنے قاری سے فکری اور متواتر مطالعے کا مطالبہ کرتے ہیں، اور ایسا اس لئے بھی کہ کبیر اجمل کے یہاں شعری عمل میں گہرا شعور و ادراک اور بصیرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار اکہرے نہیں ہوتے۔

کبیر اجمل کے یہاں ناسٹلجیا بار بار ایک زیریں لہر کے طور پر سامنے آتا ہے، وہ بار بار اپنے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں اور گذشتہ ہجر و وصل کے لمحات میں جینے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ جلد ہی اپنے حال اور موجودہ لمحوں میں لوٹ کر زندگی کے مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں ایک ایسے انسان کا تصور بار بار ابھرتا ہے جو عشق کی سرمستیوں اور سرشاریوں میں اپنی زندگی

www.urduchannel.in

گزارنا تو چاہتا ہے مگر جلد ہی اپنے عہد کی سفاک اور کربناک سچائیوں سے نظریں ملا کر زندگی کی جنگ میں شامل ہو جاتا ہے۔

بہت بے خوف یادِ رفتگاں آنے لگی تھی
تو سب کچھ بھول جانے کا ارادہ کر لیا ہے

میں عمرِ رفتہ کو آواز دینے والا تھا
تو سب حوالے کتابوں کی حد میں لوٹ گئے

لمحوں کی بازگشت میں صدیوں کی گونج تھی
اور آگہی کا مجرمِ اظہار میں ہی تھا

یہی سزا ہے کہ لمحوں کی بازگشت کے بعد
صدی صدی ترے کوچے میں بین کرتے رہیں

بہت ہوا تو ہواؤں کے ساتھ رو لوں گا
ابھی تو ضد ہے مجھے کشتیاں ڈبونے کا

لمحوں کی بازگشت سے صدیوں کی گونج کو اپنے اشعار میں تجسیم کرنے کا عمل اور اپنی کشتیوں کو ڈبونے کا جنون ہی دراصل کبیر اجمل کی شاعری کو ایک نئے مدار میں داخل کرتا ہے جہاں وہ اپنے کشف اور روحانی انرجی کو بروئے کار لا کر اپنی انا کے خلاف مصروفِ پیکار نظر آتے ہیں۔ تیز رفتار اور انٹرنیٹ اور سائبر عہد کی سفاک زندگی کے درمیان وہ انسانی خلوص اور محبتوں کو بچا کر رکھنے کا ہنر جانتے ہیں، مادی

ترقی کے اس دور میں اپنے زخموں سے روشنی اور آنسوؤں سے گہر تراشنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، زوال پزیر تہذیبی قدروں اور گم ہوتے ہوئے انسانی رشتوں کے علاوہ خوف، تشکیک، تنہائی، مایوسی، بے یقینی، بے زمینی، محرومی اور قنوطیت جیسی نفسیاتی الجھنوں کو بھی اپنی شعری سوچ کا حصہ بنانے پر قادر اس شاعر کے یہاں مثبت قدروں کے احترام کا جذبہ شدید ہے، کبیر اجمل جہاں ایک طرف یہ کہتا ہے کہ

اب تو ہونٹوں پہ سجانے کو تبسم بھی نہیں
اب مرے پاس وہ آیا تو اسے کیا دوں گا

وہیں دوسری طرف اس طرح کا شعر بھی اسکے شعری سرمایہ میں شامل ہے۔

یہ کیا کہ تیری طلب میں اداس ہو جائیں
ہمارے بیچ تو صدیوں کے فاصلے بھی نہیں

کبیر اجمل کی شعری فضا غیر مانوس سہی، غیر یقینی نہیں، وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی فکر اور وجدان کی روشنی میں اپنا تخلیقی سفر طے کر رہے ہیں اور ایک ایسے دور میں جہاں بیشتر شعراء خود کو پروجیکٹ کرنے میں مصروف ہیں وہیں کبیر اجمل نام و نمود کی خواہش کے بغیر، بے نیازانہ اور کسی صلے کی پرواہ کئے بغیر اپنے شعری سفر پہ گامزن ہیں، منتشر لمحوں کا نور انکا اولین تخلیقی نقش ہے جو انکی برسوں کے تخلیقی مراقبے اور فکری ریاضت کے بعد ہمارے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے آئندہ شعری سفر میں منتشر لمحوں کا نور سے آگے کا سفر طے کریں گے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

نذیر فتح پوری کی نظم ۔ایک جائزہ

نذیر فتح پوری ہمارے عہد کے ایسے قلم کار ہیں جو ہمہ جہت تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں،وہ بیک وقت شاعر،نثر نگار،افسانہ نگار، ناقد،ناول نگار،مترجم اور مدیر ہیں۔نذیر فتح پوری غزل ونظم ہر دو اصنافِ سخن پر یکساں تخلیقی قدرت رکھتے ہیں۔ان کی غزلوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ان کی نظموں کی کتاب ''نظم سفر'' کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں جو تاثر سب سے پہلے ابھرا وہ یہی تھا کہ اس کتاب میں نذیر فتح پوری کی شامل زیادہ تر نظمیں پابند ہیں اور تخلیق کا عمدہ نمونہ ہیں۔آج جب کہ آزاد اور نثری نظموں کی سہل پسندی،شاعروں میں ایک عام وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے ایسے ماحول میں پابند نظموں کی تخلیق واقعی ایک خوش گوار حیرت کی طرح ہے جس کے لئے نذیر فتح پوری قابلِ مبارک باد ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے مطابق ''نذیر فتح پوری اپنی نظموں میں توانائی، صلاحیت اور قوت سے کام لیتے ہیں۔اس لئے بھی کہ وہ شاعر کے ساتھ نقاد بھی ہیں لیکن انہوں نے اپنی نظموں کو فلسفیانہ نظریوں اور کلّیوں کے بیان کے لئے استعمال نہیں کیا ہے اس کے باوجود ان کی نظموں کو پڑھنے والا قدرتی طور پر ان کے خیالات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور قدرتِ اظہار، زبردست شعری کیفیت اور تاثیر سے اثر لیتا ہے۔''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی اس رائے کی روشنی میں نذیر فتح پوری کی نظموں کا جائزہ لیں تو ان کے یہاں تخلیق کے نئے گوشے منوّر ہوتے ہیں۔ان کی

نظموں کے موضوعات کا دائرہ بے حد وسیع ہے،فکر اور اسلوب کی سطح پر ان کے یہاں تنوع ہے۔انہوں نے یہاں ایک طرف جہاں ماں کے لئے نظمیں لکھی ہیں وہیں دوسری طرف کشمیر کی فریاد،جدید آدمی کا المیہ،بارود کی تلوار اور لہو کے چراغ جیسی نظمیں لکھی ہیں۔نذیر فتح پوری کا تعلق راجستھان کے فتح پور شیخاوٹی سے ہے اور وہ ایک عرصہ سے پونہ میں مقیم ہیں،اس حوالے سے دیکھیں تو ان کی کتاب نظم سفر میں ایک نظم فتح پور کے نام،اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور،اپنی نظم فتح پور آنے کے بعد،میں اپنے گاؤں آیا ہوں،سلام فتح پور کے نام جیسی نظموں کے علاوہ ایک نظم پونہ کے لئے،ایک نظم پونہ کے نام جیسی نظمیں بھی شامل ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ نذیر فتح پوری اپنی نظموں کے لئے خام مواد اپنے گرد وپیش کے ماحول اور اپنے ماضی کی یادوں کے خزانے سے حاصل کرتے ہیں،اور چونکہ وہ ایک حساس انسان ہیں اس لئے ان کی نظموں میں ان کے اپنے تجربات،مشاہدات اور محسوسات کی کارفرمائی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ نذیر فتح پوری کی نظموں میں موضوعات کی سطح پر تنوع پایا جاتا ہے،لہٰذا اگر ان کے یہاں تاج محل، آخری فیصلے کے بعد ایک نظم،کتاب لکھنے والوں کے لئے ایک نظم،اور صلاح الدین کے لئے وغیرہ نظمیں تخلیق کے عمل سے گذر کر زینتِ کتاب ہیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔اس حوالے سے وہ اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں کہ میری ہر نظم زندگی کا ایک رنگ پیش کرتی ہے۔دکھ،سکھ،اندھیرے، اجالے،کرب،سکون،ہجر و وصال، پیار،نفرت، سیاست،فساد اور ادب جہاں جہاں سے گذر ہوا نظم نے قدم روک لئے۔منظروں نے دعوتِ تخلیق دی،قلم و قرطاس سے پرانا یارانہ کام آتا گیا،نظم تخلیق ہوتی گئی۔

ماں کے لئے نظم میں انہوں نے ماں کی عظمت واحترام،صبر و ایثار اور شفقت و محبت کے علاوہ اپنی ماں سے جڑی ہوئی بچپن کی یادوں کو بھی اپنے تخلیقی عمل سے گزار

www.urduchannel.in

کر نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

چاہتوں کا دریا ماں..........اور خود ہے تشنہ ماں
دکھ کے سخت جنگل میں..........سکھ کا نرم گوشہ ماں
ہے کتاب شفقت کی..........حرف ہے دعا کا ماں
چپ ہے سارے دکھ سہ کر..........صبر کا نمونہ ماں

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے مگر شاید ہم اس کی زندگی میں قدر نہیں کرتے ہمیں اس کی قدر و منزلت کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن ہماری زندگی سے ماں کے چلے جانے کے بعد اگرچہ بظاہر کچھ بھی نہیں بدلتا مگر ماں کا سایہ ہمارے سروں سے ہٹنے کے بعد ہمیں اپنے اندر ایک خلا کا احساس ہونے لگتا ہے ،ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی سے بہت کچھ کم ہو گیا ہے۔نذیر فتح پوری بھی اپنی ماں کے انتقال کے بعد اسی احساسِ زیاں سے دوچار ہوئے اور شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر جو نظم کہی وہ ماں کے بعد ایک نظم کی صورت نمودار ہوئی۔

مری ماں کے جانے سے کچھ بھی نہ بدلا
مری ماں گئی تو بس اتنا ہوا ہے
مرے سر سے ممتا کا آنچل گیا ہے
محبت کا لہراتا بادل گیا ہے
دعاؤں کے سب سائباں ڈھہ گئے ہیں
پناہوں کے سب آسماں ڈھہ گئے ہیں
میں اب پیاسے جنگل کی صورت پڑا ہوں
میں بے سایہ ہوں دھوپ میں جل رہا ہوں
مری ماں کے جانے سے میں مر گیا ہوں

اس نظم میں ماں کے انتقال کے بعد احساسِ محرومی اور شدتِ جذبات کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے،کم و بیش یہی احساس ان کے وطن کی یادوں سے وابستہ ہیں۔وہ عرصۂ دراز سے پونہ میں مقیم ہیں مگر ان کا دل تو فتح پور شیخاوٹی کی مٹی کی خوشبو میں بستا ہے اور پرانی یادوں اور پرانے زخموں کو کریدتا رہتا ہے۔

پردیس میں کیا کیا یاد آیا
یہ کیسی وطن کی یادیں ہیں
کچھ آہیں ہیں فریادیں ہیں
کیا اور لکھوں اس کاغذ پر
ہوں زخم لکھے جس کاغذ پر
تنہائی میں آنسو ٹپکے ہیں
یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں
ان ٹکڑوں میں فریادیں ہیں
یہ میرے وطن کی یادیں ہیں
پر دیس میں کیا کیا یاد آیا

(ایک نظم فتح پور کے نام)

اس نظم میں پانچ بند ہیں اور سبھی میں اسی طرح کی یادوں کے زخموں کو ہرا رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔نذیر فتح پوری کا یہ ناسٹلجیا ان کی متعدد نظموں میں موجود ہے۔ان کے آبائی وطن فتح پور شیخاوٹی سے ان کا جذباتی لگاؤ فطری ہے مگر وطنِ ثانی پونہ سے بھی ان کی محبت قابلِ ذکر ہے۔پونہ شہر جس نے نذیر فتح پوری کی شخصیت کو سجا سنوار کر نیا وقار عطا کیا ہے اس کے لئے بھی انہوں نے متعدد نظمیں لکھی ہیں،جس میں ایک نظم پونہ کے لئے،ایک نظم پونہ کے نام اور ترانۂ اعظم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ایک نظم پونہ کے لئے میں اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

www.urduchannel.in

ہندو مسلم کے خوابوں کا حاصل ہے تو
بھائی چارے کے دریا کا حاصل ہے تو

ہے محبت میں ڈوبا ہوا تیرا من
اے عروسِ دکن، اے عروسِ دکن

اے نذیر اب تو اپنا یہی گاؤں ہے
اس کے آنچل کی ممتا بھری چھاؤں ہے

پیار اس کا مرے دل میں ہے ضوفگن
اے عروسِ دکن ، اے عروسِ دکن

ایک نظم پونہ کے نام میں نذیر فتح پوری نے پونہ کی ادبی ،تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کو اپنی نظم کا مرکزی خیال بنایا ہے چونکہ نذیر فتح پوری ایک عرصہ دراز سے پونہ کی سرزمین پر قیام پزیر ہیں لہٰذا اس شہر کے حوالے سے ان کے جذبات اور احساسات داخلی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

شعرو ادب کے ہوتے ہیں ہر وقت تذکرے
شاداب و خوش گوار ہے ، پونہ کی سرزمیں

جلتی ہیں ننھے ذہنوں میں اردو کی مشعلیں
تعلیم کا دیار ہے، پونہ کی سر زمیں

پہلو آیا جو اسے اپنا بنا لیا
اس درجہ جاں نثار ہے پونہ کی سرزمیں

نذیر فتح پوری چونکہ ایک حساس ذہن کے مالک ہیں لہٰذا ان کے تخلیقی عمل میں ان کے فکری پھیلاؤ کی کارفرمائی نظر آتی ہے،انہوں نے ایک نظم جدید آدمی کا المیہ کے عنوان سے بھی اپنی کتاب نظم سفر میں شامل کی ہے،جس میں موجودہ عہد کے انسان کے ان مسائل ومصائب کا ذکر کیا گیا ہے، جو انٹرنیٹ اور سائبر عہد کی تیز رفتار زندگی نے عام آدمی کا نصیب بنا دیا ہے۔

اپنے غم خواروں سے رشتہ توڑ کر
ٹوٹے شیشے جوڑتا ہے آدمی
اپنی سانسوں کے شجر کی شاخ کا
خشک پتہ بن گیا ہے آدمی
اس سے بڑھ کر اور کیا تمثیل دوں
صرف زخموں کی قبا ہے آدمی
سر اٹھانے کے بھی اب قابل نہیں
اتنی حد تک گر چکا ہے آدمی

اپنی نظم ''لہو کے چراغ'' میں نذیر فتح پوری نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا ذکر نہایت عمدگی اور تخلیقی ہنرمندی سے کیا ہے جس کے لئے وہ یقینی طور پر قابلِ مبارک باد ہیں۔

جو دیپ جلتا ہے مندر میں میں روشنی کے لئے
وہی تو صحنِ حرم میں بھی جگمگاتا ہے

www.urduchannel.in

جو فرق ہم نے کیا ہے رحیم و رام کے ساتھ
اسی خلیج اسی فرق کو مٹاتا ہے

اجالا جس کا کوئی دھرم ہے نہ مذہب ہے
بغیر فرق سبھی کو گلے لگاتا ہے

صنم کدہ ہو،حرم ہو کہ بزمِ میخانہ
ہر اک کے گوشۂ ظلمت کو جگمگاتا ہے

نذیر فتح پوری نے نظموں کی موجودہ ہیئت اور تکنیک میں تجربات کو بھی اپنی تخلیقی سوچ کا حصّہ بنایا ہے۔انہوں نے سہ سطری نظموں اور ثلاثی کے علاوہ تکونی میں بھی کامیاب تجربہ کیا ہے جس کے لئے ناقدینِ شعروادب نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔تکونی کا ایک مخصوص فارم ہے جس میں دو چیزیں عدالت میں پہنچتی ہیں اور ان کا مقدمہ سننے کے بعد شاعر اپنا فیصلہ سناتا ہے یا اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ایک نظم قرطاس وقلم میں،قرطاس،قلم کے بارے میں کچھ کہتا یا شکایت کرتا ہے پھر قلم،قرطاس کے بارے میں اپنی شکایت یا رائے ظاہر کرتا ہے،ان تمام بحث ومباحثہ کے بعد شاعر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔مثال کے طور پر

قلم،قرطاس سے کہتا ہے

میرے چلنے سے ہی چلتا ہے جہاں میں تیرا نام
میں نہ لکھوں تو تری ہستی کا مطلب کچھ نہیں

پھر قرطاس،قلم کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہے

میں نہ لکھنے کی اجازت دوں تو ہے بیکار تو
میری ہستی ہی تری ہستی کی صبح و شام ہے

یہ ساری گفتگو سننے کے بعد،اوراس مقدمے پر غور وفکر کرنے کے بعد شاعر اپنا فیصلہ اس طرح سناتا ہے۔

فیصلہ میرا سنو،اس بحث پر ہے بس یہی
آدمی کے ہاتھ میں ہے ان کی ہستی کا علم

آدمی کو لکھنے پڑھنے سے اگر رغبت نہیں
پھر قلم قرطاس کی ہستی کا کچھ مطلب نہیں

شاعری میں نئے تجربات کی گنجائش ہمیشہ ادب میں تغیر اور اس کے ارتقاء کی ضامن ہوتی ہے،لہٰذا اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے ۔نذیر فتح پوری کے یہاں نئے تجربات کے خیر مقدم کا جذبہ بدرجہء اتم موجود ہے۔نذیر فتح پوری اپنے اردگرد کے موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول سے متفق نہیں،آج جس طرح کی دہشت گردی اور سیاسی خوں ریزی کا ماحول ملک و بیرونِ ملک بنا ہوا ہے اس سے کوئی بھی ذی حس انسان متفق نہیں ہوسکتا لہٰذا نذیر فتح پوری بھی اس حوالے سے اپنی فکرمندی کا اظہار کرنے میں حق بجانب ہیں ان کے مطابق دین دھرم اب لڑنے لڑانے کے کام آتے ہیں،مارنے والے نہیں جانتے کہ وہ کس کو مار رہے ہیں،کیوں مار رہے ہیں،کس کے اشارے پر مار رہے ہیں،کس کے لئے مار رہے ہیں۔زندگی اور موت کا سودا کہاں طے پاتا ہے۔کتنے کا داؤ کھیلا جاتا ہے۔شاعر پریشان ہے،موسیقی کار حیران ہے،افسانہ نگار بدحواس ہے،گلوکار کی آواز سوز میں ڈوبی ہے ۔ یہ دکھ اب ایسے ہی

www.urduchannel.in

لوگوں پر نازل ہو رہا ہے۔حالات کی سفاکی اب لفظوں میں تڑپ رہی ہے۔شاعری نوحہ کناں ہے،افسانہ غم زدہ ہے،کہانی درد کی آخری سرحد پہ آ کر ٹھہر گئی ہے۔آج ہر دکھ صرف فنکاری کے دروازے سے انسانیت کے دل میں داخل ہو رہا ہے۔

تخلیقی سوچ کی کوئی سرحد نہیں ہوتی وہ بیک وقت محبت کے نغمے گا سکتی ہے اور عراق وشام اور فلسطین میں بے گناہ مارے جارہے انسان کے خون کی خوشبو سے نئی تاریخ رقم کر سکتی ہے۔نذیر فتح پوری کی نظموں کا کینوس وسیع ہے،انہوں نے انسانی رشتوں، بکھرتی ٹوٹتی تہذیبی قدروں اور جذباتی موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اسکے علاوہ ان کے یہاں بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کا بھی عکس ملتا ہے،تخلیقی سوچ کا اتنا وسیع دائرہ بہت کم شعراء کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔نذیر فتح پوری ایک عرصہ سے اپنی تخلیقی ریاضت میں مصروف ہیں مگر فکری آنچ میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔یہ ایک خوش آئند امر ہے اور یہ امید بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنی نظموں کے نئے ذائقے سے قارئین کو روشناس کراتے رہیں گے۔

☆☆☆

استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے
اور ڈاکٹر مختار شمیم

ڈاکٹر مختار شمیم ہمارے عہد کے ایک معتبر اور سنجیدہ ناقد و محقق ہیں اس کے علاوہ قابلِ ذکر شاعر بھی ہیں،اب تک ان کی شاعری کے متعدد مجموعے اور کئی نثری کتب منظرِ عام پر آ کر ناقدینِ شعر و ادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔زیرِ نظر کتاب ''استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ان کے شفقت نامے''ان کی نئی کتاب ہے جو ڈاکٹر ابو محمد سحر کی شخصیت،سوانح اور ان کی ادبی خدمات کے علاوہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو دسمبر ۱۹۷۳ سے فروری ۱۹۹۷ تک ڈاکٹر مختار شمیم کے نام لکھے گئے ہیں۔اکابرینِ ادب کے خطوط کے مطالعے سے فنی رموز و نکات اور ادب کی باریکیوں سے آگاہی ہوتی تھی مگر اب موبائل،سائبر اور انٹرنیٹ عہد کے طفیل ادبی خطوط نگاری کی رسم ہی اٹھ گئی ہے لہٰذا اب یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آنے والے وقتوں میں ادبی خطوط پر مشتمل کتابیں شائع بھی ہوں گی یا نہیں،ایسے میں ڈاکٹر مختار شمیم کی یہ کتاب غنیمت ہے اور اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس سے ڈاکٹر ابو محمد سحر کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کو نہ صرف سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ڈاکٹر موصوف سے مصنف کے

www.urduchannel.in

ادبی اور ذاتی رشتوں کی نوعیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کی شخصیت اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں شفقت نامے کے عنوان سے ان خطوط کو شامل کیا گیا ہے جو ڈاکٹر مختار شمیم کے نام دسمبر ۱۹۷۳ سے فروری ۱۹۹۷ کے دوران تحریر کئے گئے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر ابو محمد سحر کالج میں ڈاکٹر مختار شمیم کے استاد بھی رہے ہیں لہٰذا مصنف کی تحریر میں ادب و احترام ناگزیر ہے، ڈاکٹر ابو محمد سحر کی شخصی اور ذاتی زندگی اور ان سے وابستہ یادوں کے اظہار میں مصنف کے جذباتی لگاؤ کو بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں شامل تحریروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر اپنی نجی زندگی میں نظم و ضبط کے پابند اور اصولوں کے پکے تھے۔ ڈاکٹر مختار شمیم نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر دراصل اس تہذیب کے پروردہ تھے جہاں اخلاقیات کے پہلوؤں اور خود شناسی کے تمام اصولوں کے مابین باعزت اور پروقار زندگی کرنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے، اس لئے وہ اپنے آپ میں تنہا تھے......وہ ذہین و فہیم آدمی تھے اور واقعی ایک مثالی شخصیت تھے، ان کا کردار اپنے افکار و اعمال کے اعتبار سے کبھی کسی تضاد کا شکار نہیں رہا۔ مصنف کی اس رائے سے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور زندگی کرنے کی شعور و آگہی اور متعدد دلچسپیوں کے بارے میں خاطر خواہ جانکاری حاصل ہوتی ہے اس کے علاوہ ان کی ادبی شخصیت کے اس پہلو کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر نہ تو کسی بڑی شخصیت سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی جذباتی طور پر کسی سے متاثر ہوئے یہ ایک ایسا وصف ہے جو بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتا ہے۔ اردو میں لسانیات کے موضوع پر کام کرنے والوں میں کئی جید ادبی شخصیات کے نام نمایاں طور پر اہمیت کے حامل ہیں، جن میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور وغیرہ سرِ فہرست ہیں مگر اس شعبے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر

کے کام اور ادب میں ان کے کنٹریبیوشن کو کسی بھی طرح کم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ''اردو املا اور اس کی اصلاح'' ان کی بے حد اہم کتاب ہے جس کا دوسرا ایڈیشن ان کے انتقال کے بعد ۲۰۰۴ میں ان کی اہلیہ نے شائع کرایا۔

ڈاکٹر مختار شمیم نے اپنے استاد ڈاکٹر ابو محمد سحر کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو کئی زاویوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اس حوالے سے زیر نظر کتاب میں 'اردو میں قصیدہ نگاری' کے حوالے سے ڈاکٹر موصوف کے تحقیقی کام کا خاطر خواہ جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے معاصرین کے اعترافات کا بھی ذکر کیا گیا۔ مثلاً پاکستان کے نامور قصیدہ نگار ساحر لکھنوی نے اپنی کتاب کے طویل مقدمہ میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کے بعض مباحث اور انتقادی فیصلوں کو نہ صرف یہ کہ احترام کی نظر سے دیکھا ہے بلکہ اپنی کتاب نذر کرتے وقت انہیں ''اردو قصیدہ کا معتبر اور نامور محقق'' کے الفاظ سے بھی یاد کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ڈاکٹر مختار شمیم کے نام تحریر کیے ہیں۔ ان خطوط کی زبان صاف ستھری، شستہ اور حشو زوائد سے پاک ہے حالانکہ عام طور پر خطوط کے مواد ذاتی اور گھریلو نوعیت کے ہوتے ہیں، مگر ان خطوط میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کی علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کی جھلک اور ان کی شخصیت کے مختلف اور سنجیدہ پہلوؤں کے عکس بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مختار شمیم ''استاذی ڈاکٹر ابو محمد سحر کے خطوط بھی ان کی نگارشات کا حصّہ ہیں، ان کے تحریر کردہ وہ تمام مکتوبات جو ان کے معاصرین اور مشاہیر کے نام ہیں اگر شائع ہو جائیں تو یقیناً ان مکتوبات کی اہمیت و افادیت سے ادب کا کوئی نہ کوئی گوشہ ضرور منوّر ہو سکے گا.....ان کی پروقار عالمانہ شخصیت کا پرتو ان کی تحریروں میں اور خصوصاً مکاتیب میں بھی جھلکتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں ان کے خطوط کے جواب نہایت سنجیدگی سے دیا کرتا تھا اور ان کی کسی نہ کسی بات سے مرعوب ہو جانا میری سرشت میں داخل تھا اسی لئے وہ بار بار اپنے

www.urduchannel.in

شفقت ناموں میں اعادہ فرماتے تھے کہ 'میرے خط کو ذرا نرم انداز میں پڑھا کیجیے۔'

کتاب میں شامل مکتوبات کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ڈاکٹر ابومحمد سحر ایک بلند پایہ ادیب اور محقق تھے،ان کی تحریر نہایت سنجیدہ، متین اور شگفتہ ہے نیز مکتوب الیہ سے ان کے رشتوں کی نوعیت بے حد مشفقانہ ہے۔زیادہ تر خطوط میں ذاتی نوعیت کی تحریریں ہیں یا پھر اپنی کتابوں کی کتابت، طباعت اور دیگر امور کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی کتابت اور طباعت کے معیار کے حوالے سے کتنے حساس محتاط اور فکرمند رہتے تھے۔مثلاً ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ کے خط میں لکھتے ہیں کہ 'لیکن میں جانتا ہوں کہ کتاب کا صحیح چھپوانا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا صحیح لکھنا،اس لئے غلطیوں سے چھٹکارا ملنے کی بظاہر کوئی توقع نہیں۔عین ممکن ہے کہ نہ صرف پرانے ایڈیشن کی غلطیاں باقی رہ جائیں بلکہ نئی غلطیاں ہوجائیں۔۶ اگست ۱۹۸۲ کے خط تحریر کرتے ہیں، پاشا پریس میں چھپائی شروع ہوگئی ہے۔ایک کاپی جو پہلے نکالی گئی تھی،بہت خراب ہوگئی تھی۔اختر میاں نے دوسری کاپیاں پھر سے جوڑیں تو اطمینان ہوا ورنہ میں تو بہت گھبرا گیا تھا۔آٹھ صفحات جو پہلے نکل گئے تھے کسی طرح کھپ جائیں گے۔اس نوع کے احساسات کا اظہار ان کے کئی اور خطوط میں ہوا ہے،اس کے علاوہ ڈاکٹر ابومحمد سحر نے جن خطوط میں لسانیات اور ادبی وشعری رموز ونکات پر گفتگو کی ہے وہ نہ صرف دلچسپ بلکہ معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۳/اپریل ۱۹۷۶ کے خط میں تحریر کرتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ فلزات کا واحد فلز ہے نہ کہ فلزہ،اس طرح حسد، حاسد کی جمع کے طور پر بالکل صحیح ہے۔نہیب بمعنی خوف ودہشت اور ڈراونی آواز کے لئے سند پیش کی جاسکتی ہے۔رشید حسن خاں نے اس کے معنی صرف خوف،ڈر اور دہشت لکھے ہیں،جس سے بہر حال برکاتی کے معنی کی تائید نہیں ہوتی باوجود اس کے کہ وہ بھی لغات میں ملتے ہیں۔ڈاکٹر ابومحمد سحر چونکہ ماہرِ لسانیات تھے لہٰذا کئی خطوط میں اس حوالے سے بھی گفتگو ملتی ہے۔اپنے ایک خط میں

وہ رقم طراز ہیں کہ 'کتابت کے بارے میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔مسودے میں بھی اس بابت احتیاط نہیں برتی ہے۔یہ اصول تو بہت سیدھا سادہ ہے کہ مفرد والے الفاظ کو ملا کر نہ لکھا جائے۔لیکن مرکبات کو کہاں توڑیں کہاں نہ توڑیں اس کا فیصلہ بہت مشکل ہے۔ایسے موقعوں پر مروج املا کے مطابق دیکھنا غالباً بہتر ہے۔'ذ' اور 'ز' کے استعمال میں میں نے غالباً احتیاط برتی ہے۔ڈاکٹر موصوف کے خطوط سے اس طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں،جن میں لسانیات کے متعلق باریک معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر ابومحمد سحر ناقد ومحقق اور ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ شاعر بھی تھے،اور ان کی شاعری میں زبان کی صحت اور گرامر کا خاص التزام ملتا ہے جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے اشعار میں تبدیلیاں کرتے رہتے تھے جس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۸۰ کے ایک خط میں ڈاکٹر مختار شمیم کو ایک شعر لکھا

اور تو کچھ نہ ملا حصّۂ فن ہم کو سحر
شاخِ احساس سے اک برگِ غزل لائے ہیں

مگر اپنے ۱۰ ستمبر کے خط میں اس شعر کے پہلے مصرعے میں تبدیلی کردی جس سے شعر اور بہتر ہوگیا۔

اور تو کچھ نہ سرِ باغِ سخن ہم کو ملا
شاخِ احساس سے اک برگِ غزل لائے ہیں

ڈاکٹر مختار شمیم کی زیرِ نظر کتاب سے ڈاکٹر ابومحمد سحر کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ وہ زمانہء طالب علمی میں کرکٹ کے نہایت عمدہ کھلاڑی رہے اور یونیورسٹی ٹیم کے کیپٹن کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔اس کے علاوہ وہ لان ٹینس میں بھی ہاتھ آزماتے رہے ہیں۔گھر میں وہ شطرنج کے ایک ماہر کھلاڑی کی حیثیت

www.urduchannel.in

سے اپنے دوستوں کے ساتھ اپنا ہنر دکھایا کرتے تھے انہیں کبوتروں سے نہ صرف شغف تھا بلکہ کبوتروں کی مختلف نسلوں اور ان کی خصوصیات کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل تھیں، اپنے گھر میں تعمیر کے دوران بھی وہ ایک ماہرِ تعمیر کی طرح دلچسپی لیتے تھے۔ ایک شخص میں اتنی ساری خصوصیات کا مجتمع ہو جانا اس لئے بھی حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر ایک علمی، تحقیقی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے ،جن کا تعلق تمام عمر درس وتدریس سے رہا ہے، یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ با قاعدہ ایک سماجی اور گھریلو انسان تھے اور اپنی خانگی ذمہ داریوں کو نباہتے ہوئے اتنا سارا ادبی اور تحقیقی کام کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ میرے نزدیک ڈاکٹر مختار شمیم قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر ابو محمد کے اتنے سارے خطوط کو کتابی صورت میں پیش کر کے ادب کی نئی نسل کو اپنے پیش رووں سے متعارف کرنے کا اہم ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ مکتوبات پر مشتمل ان کی یہ کتاب اس لئے بھی سنگِ میل ثابت ہوگی کہ اب ادب میں مکتوب نگاری کی رسم اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔

☆☆☆

اگلے پڑاؤ سے پہلے۔ایک خوشگوار تخلیقی تجربہ

اس بات سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ آج آزاد نظم اردو میں تخلیقی اظہار کا ایک ''پاور فل میڈیم'' ہے۔ اگر چہ جدیدیت کے ابتدائی دور میں فیشن زدہ جدید غزل کی طرح آزاد نظم بھی ایک طرح کی بے چہرگی اور بے سمتی کا شکار تھی۔ پیچیدہ علامات اور مبہم استعارات کے استعمال سے آزاد نظموں کی عدم ترسیل وتفہیم کے سبب قاری سے جدید ادب کا رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا تھا ۔مگر مسلسل تخلیقی تجربے سے گزرتے ہوئے آزاد نظموں نے بھی فیشن پرست جدیدیت سے بیزار ہو کر اپنا رشتہ فکری اور اسلوبیاتی سطح پر اپنے عہد کی تہذیبی شعور وآگہی سے استوار کرلیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد کی نسل نے مایوسی، تنہائی اور داخلی انتشار سے آزادی حاصل کر کے عصری مسائل ومصائب اور جدید فکری تقاضوں کو اپنی تخلیقی سوچ کا محور بنالیا ہے۔

''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' مغربی بنگال کی قابلِ ذکر شاعرہ شہناز نبی کی نظموں پر مشتمل ایک ایسا تخلیقی اظہار ہے جس کے مطالعے کے دوران میں نے بار بار یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا ایک وسیع کینوس ہے جس پر مختلف رنگوں سے بنائی ہوئی بے شمار تصویریں ہیں جن میں زندگی کے مختلف شیڈس نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں وژن ہے، تخلیقی مواد ہے اور نظم کہنے کا سلیقہ بھی اور یہ سب مل کر انہیں ایک ایسی کامیاب نظم گو شاعرہ بناتے ہیں، جو بیک وقت زندگی سے محبت بھی کرتی ہے اور

www.urduchannel.in

زندگی کی سفاکیوں کے خلاف احتجاج بھی کرتی ہے۔شہناز نبی کی نظموں میں اپنی تہذیبی قدروں سے محبت کا جذبہ بھی ہے اور فرسودہ روایتوں سے بغاوت کا حوصلہ بھی ۔ان کی نظموں میں سادگی اور شگفتگی کو جابہ جا محسوس کیا جا سکتا ہے مگر کہیں کہیں ان کے لہجے میں ایک طرح کی کرختگی اور کھردرا پن بھی دکھائی دیتا ہے جو موجودہ سیاسی اور سماجی نظام کی ناہمواریوں کے تناظر میں فطری قرار دیا جاسکتا ہے۔

شہناز نبی کی نظموں میں نسوانی جذبات اور احساسات کی کارفرمائی بھی ملتی ہے مگر یہ ان کی نظمیہ شاعری کا غالب اور معتبر حوالہ نہیں بلکہ ان کے یہاں تو تخلیقی سوچ کا ایک بڑا حصّہ عصری شعور وآگہی سے عبارت ہے جس سے ان کے وژن کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ان کے یہاں ماضی کو کریدنے کا عمل بھی شدید ہے وہ بار بار اپنے بچپن کی یادوں کے جھروکے سے اپنے ماضی میں جھانکتی ہیں اور ماضی کی تلخ وشیریں تجربات کو موجودہ مسائل ومصائب کی اساس پر پرکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے اس عمل میں کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔اپنی ایک نظم ''نیا پرانا قصہ'' میں بچپن کے ایک خوبصورت تجربے کو یوں بیان کرتی ہیں۔

بہت پہلے کا قصہ ہے
میں جب ایک ننھی بچی تھی
تو اکثر کوئی تتلی میرے کمرے میں چلی آتی
کبھی ابّا کی سگرٹ کی کسی ڈبیا کو چھوتی وہ
کبھی رنگین کیلینڈر سے کچھ سرگوشیاں کرتی
میں اس کو دیکھتی
خوش ہوتی بے حد
پھر مچل جاتی
مگر سمجھاتی تھیں امّی مجھے کچھ اس بہانے سے

کہ اس تتلی میں چھپ کر میری ماں ملنے کو آتی ہے
وہ سب جو مر چکے ہیں اور زمیں کا رزق ٹھہرے ہیں
فقط تتلی کی صورت وہ ہمیں ملنے کو آتے ہیں
مری بچی سنو! تتلی پکڑنے سے خدا ناراض ہوتا
ہے۔(نیا پرانا قصہ)

اپنی ایک اور نظم ''زنجیر'' میں بھی اپنے معصوم بچپن کی خوشگوار یادوں کو شہناز نبی نے کچھ یوں نظم کیا ہے۔

ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے زنجیر بنانا
ایک عجیب سا کھیل تھا بچپن میں
رنگ برنگی سنہری روپہلی چوڑیاں
پہلی کے چاند سی
چن چن کر بھر لیتے تھے جھولی میں
ایک ایک کر کے موم بتی کی آگ میں موڑتے
حلقے بناتے
اور ایک زنجیر مکمل .... (زنجیر)

شہناز نبی کی نظموں کے محوّلہ بالا اقتباسات کے حوالے سے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ان کے یہاں بچپن کی یادیں ''ناسٹلجیا'' کی صورت بار بار ان کی نظموں میں نمودار ہوتی ہیں اور کئی بار اپنی موجودہ زندگی کی ناہمواریوں اور ناآسودگیوں کی وجہ سے بچپن کی خوشگوار یادوں اور ماضی کے روشن لمحات میں پناہ لینے کی کوشش کرتی ہیں اور یہ ایک طرح کا فطری عمل بھی ہے۔چوڑیوں سے زنجیر بنانے کے کھیل کا حصہ ہم میں سے بہت سے لوگ رہے ہوں گے مگر اسے نظموں میں برتنے کا خیال کسی کو بھی نہیں آیا ہوگا۔رنگ برنگی چوڑیوں سے زنجیر بنانا اور یہ یاد رکھنا کہ کون سی چوڑی کس کی

www.urduchannel.in

ہے بظاہر کوئی خاص بات نہیں مگر بچپن گذر جانے کے بعد ان چوڑیوں کے ٹکڑوں کو اپنی ماں کی چوڑیوں سے منسوب کرنا ہی دراصل موجودہ عہد میں رشتوں کو زندگی سے جوڑے رکھنے کی کوشش کا حصّہ ہے۔ اپنی نظم ''نیا پرانا قصّہ'' میں بھی شہناز نبی نے تتلی کو استعارہ بنا کر ماں کی یاد کو زندگی کا اہم حصّہ بنا دینے کی کامیاب کوشش کی ہے جس کے لئے ان کی تخیلی اور تخلیقی قوت کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اپنی ایک اور نظم ''ایک نظم اپنی ماں کے نام'' میں بھی شہناز نبی نے اپنے ماضی میں جھانک کر ماں کی شخصیت اور کردار کے حوالے سے خود کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی اس نظم سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کی شخصیت اور کردار پر ان کی ماں کی چھاپ بہت گہری ہے، اور وہ چاہ کر بھی اپنی ماں کی یادوں کو خود سے الگ نہیں کر پاتیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھنا چاہتی ہیں مگر شاید ان کی ماں کے تجربات ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ابھی تک اپنی ماں کے ساتھ نال سے جڑی ہوئی ہیں اور اس سے الگ ہونا ان کے لئے ممکن نہیں، اپنے ماضی سے اتنی گہری وابستگی نفسیاتی بھی ہوسکتی ہے اور اضطراری بھی، وہ ماضی کی یادوں سے دستبردار بھی ہونا چاہتی ہیں، جسکا ثبوت ان کی اس نظم سے فراہم کیا جاسکتا ہے۔

میرا کل
اگر میرے پیچھے آنا چاہتا ہے تو آئے
اس کی مرضی
مگر مجھ کو مڑ کے دیکھنے کو نہ کہے
میرا کل اگر مجھ سے آگے نکلنا چاہتا ہے
تو اس کی مرضی
مگر مجھے اپنے قدموں کے نقوش اپنانے کو نہ
کہے......(اپنے لئے ایک دن)

زیر نظر مجموعے ''اگلے پڑاؤ سے پہلے'' میں حمل اور ''مینوپاز'' کے عنوان سے دو ایسی نظمیں شامل ہیں جو انہیں اپنے اندر ایک مکمل عورت ہونے کی سرشاری سے ہم کنار کرتی ہیں۔

بڑے جتن سے اک ایک نقطہ
اتارا دل میں
وہ نقطہ، نقطہ رواں ہے تن میں
سما گیا ہے مرے شکم میں
وہ اپنی تجسیم چاہتا ہے
تجھے گئے تو زمانہ بیتا

یہ تیرا چہرہ پڑا ہے جوں توں
میں اس کو ساقط کہوں تو کیسے
کہ میرے پہرے پہ روشنی ہے
کہ نقطے نقطے میں زندگی ہے .... (حمل)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ شہناز نبی کے یہاں ایک وسیع تخلیقی وژن ہے اور موضوعات میں تنوع ہے، لہٰذا انکی نظموں میں داخلی اور خارجی ہر دو سطح پر فکری نظام کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں زندگی سے سروکار کی نظمیں ہیں، ان کے یہاں درد، محرومی اور ناآسودگی کے علاوہ بے یقینی اور بے زمینی کے تخلیقی اظہار کی تہذیب اور شائستگی موجود ہے۔ فرد اور معاشرے کے درمیان بلکہ مرد اور عورت کے درمیان بھی بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کو نہایت خوش سلیقگی سے پیش کرنے کی ہنرمندی ہے، جسے ان کا تخلیقی امتیاز ہی کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہونے کی حوصلہ مندی بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ عام طور سے آزاد نظموں کو

www.urduchannel.in

غزل سے فرار کی صورت اور سہل پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر میرے نزدیک آزاد نظموں کی تخلیق ایک مشکل کام ہے کیونکہ اس کا ڈکشن غزل سے یکسر مختلف ہے یہی نہیں اس میں براہِ راست اظہار سے گریز اور ایجاز وانہماک کی شدید ضرورت کے سبب اس صنف سخن کو غزل سے کم کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ حالانکہ اب ان خصوصیات کے پیمانے پر نظمیں تخلیق کرنے والے شعراء کم ہی رہ گئے ہیں مگر مجھے خوشی ہے کہ شہناز نبی کی نظمیں اپنے ڈکشن اور اسلوب کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں اپنے ہم عصر تخلیق کاروں کے مقابلے نمایاں بھی کرتی ہیں۔

مری تیری باتیں سنے گا کوئی کیوں
اگر سن بھی لے تو یقیں کیوں کرے گا
کہ اب حق پہ ایمان لانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔
۔(اقرا بسم۔۔)

جانے کب سے اپنے آپ پر
اپنا ہی دروازہ بند کر رکھا ہے
پہلے تو اکا دکا دستک
باریاب بھی ہو جایا کرتی تھی
۔۔۔۔۔۔۔(ملاقاتی)

گئے وہ دن
کہ گہرے کاسنی بادل کے گھرتے ہی
بدن لو دینے لگتا تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(ساتواں
موسم)

میرا قصور صرف اتنا ہے
کہ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا

میں اپنی قسمت کا کھاتی ہوں......(ساتویں شہزادی کا قصہ)
تمہاری انا کے جھوٹے جنگلوں میں بھٹکنے کا
کوئی شوق نہیں اسے
اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے جانے کے بعد
تمہاری جوتیاں حکومت کرتی رہیں گی
تو یہ تمہاری حماقت ہے...........(نیا ادھیائے)

شہناز نبی کی نظموں کے محولہ بالا اقتباسات کو تحریر کرنے کا مقصد محض یہی ثابت کرنا ہے کہ ان کے یہاں نظموں میں زندگی کے مختلف ''شیڈس'' اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ان کے یہاں عورت محض جنس یا commodity نہیں ہے جو مرد کے رحم و کرم پر زندگی کرنے کو مجبور ہے، بلکہ وہ اپنے طور پر زندگی میں ایک نیا ادھیائے لکھنا چاہتی ہے اور اپنے وجود کی سالمیت اور پاکیزگی کے ساتھ اپنے بل پر زندہ رہنا چاہتی ہے، وہ ضرورت پڑنے پر خود پر بھی اپنا دروازہ بند کر سکتی ہے اور مرد کی جھوٹی انا کے سامنے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ اگر چہ اسے احساس ہے کہ اسے اس سرکشی کی سزا بھی ملنی طے ہے یعنی آدم کے سارے گناہوں کی پاداش اسی کو جھیلنی ہے کہ یہی اس کا مقدر ہے۔ شہناز نبی کے یہاں نظموں کے تخلیقی عمل میں کئی بار اپنے وجود کی نفی کا بھی احساس ہوتا ہے مگر ان کے یہاں اپنی ذات کے عرفان کا احساس اور اپنے وجود کے اثبات کا حوصلہ ان کے منفی خیالات پر غالب ہے۔

میں یہ کہنے میں بجا طور پر حق بجانب ہوں کہ شہناز نبی کی نظمیہ شاعری میں مشرقی تہذیب و تمدن اور مذہبی اقدار کی حرمت کا اظہار بھی قابلِ ذکر ہے اور غالباً یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں تلمیحی علامات اور کربلا کے استعارے کی مدد سے نئے فکری نظام کو وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنی ایک نظم میں کربلا کے استعارے کو عصری تناظر میں

www.urduchannel.in

قربانی، ہمت اور صبر واستقلال کو عورت کی وجودی کائنات کا معتبر حوالہ بنا دیا ہے۔

یقیں ہے مجھے سانس جانے تلک
ان کی تلواریں ٹھہری نہ ہوں گی.
حوصلہ ان کا ٹوٹا نہ ہوگا
اب تو سورج بھی پچھّم میں ڈوبا
عصر کیا اب عشاء کی گھڑی ہے
ہر طرف ایک عجب خامشی ہے.
کہیں سے خبر کوئی آتی نہیں
بال کھولے ہوئے
کب سے ہوں منتظر
بین کے واسطے............(کربلا)

بدخوابی سے بچنے کے تھے کیسے کیسے نسخے
بسم اللہ
پھر پہلا کلمہ، دوسرا کلمہ، چاروں قل
اور داہنی کروٹ سونا............(نئے یگ کا خواب)

ہر اک شب سونے سے پہلے
کئی سورے
کئی کلمے
گناہوں کی معافی کی دعا
روزی کی خوش حالی کی منت
اور پھر نیندوں میں بھی
اس گفتگو کا سلسلہ............(کٹّی)

مجھے خوشی ہے کہ اگلے پڑاؤ سے پہلے کی نظموں کی قرأت سے قاری کو ایک طرح کے کیف وانبساط اور سرشاری کا احساس ہوتا ہے، ان کے مجموعے میں کئی ایسی نظمیں ہیں جن میں گہری فکر اور معنوی جہتیں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں، اور قاری کو نئے جہانوں کی سیر کراتی ہیں، اگرچہ ان کی نظموں میں کوئی فلسفہ زدگی اور پیچیدہ علاماتی نظام نہیں لیکن فکری سطح پر نظموں کی ترسیل اتنی آسان بھی نہیں۔ ایسی نظموں کے زمرے میں معصوم بھیڑیں، اجل مجھ سے مل، الحقّ، لاتقنطوا، ستائیس شب کا جرمانہ، بائیں پسلی کے انکار تک، اور شہر سے خالی ہاتھ جانا پڑے گا وغیرہ کو رکھا جا سکتا ہے۔ شہناز نبی کی نظموں کے تخلیقی نظام میں ایک طرح کا ٹھہراؤ اور stability ہے اور میرے نزدیک یہی خصوصیات ان کے یہاں نظموں کی تخلیق کا جواز بھی ہے۔ میں نے ان کی نظموں کا مطالعہ خاصی توجہ اور دلچسپی سے کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی نظموں کے thought process میں تسلسل، انہماک اور توانائی ہے جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نظمیہ شاعری کو نئے ادبی تناظر میں خاصی اہمیت حاصل ہے، مگر میرے علم کے مطابق ہمارے سکّہ بند ناقدین نے ان کی نظموں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے جس کا مجھے افسوس ہے۔ ان کا تخلیقی عمل جاری ہے لہٰذا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ اگلے پڑاؤ سے پہلے کے آگے کا سفر طے کریں گی۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

ظفر گورکھپوری کی غزل....نئے تخلیقی تناظر میں

شعر لکھے، خواب دیکھے ، دکھ کمائے
اور ہم سے زندگی میں کیا ہوا

ظفر گورکھپوری کا یہ شعر ایک ایسے ذاتی کرب کا اظہار ہے، جس سے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی سطح پر ہر تخلیق کار دوچار ہوتا ہے۔ اچھے شعر کی تخلیق کی خواہش، تخلیق کار کو مسلسل خواب دیکھنے پر مضبور کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک کرب ناک نا آسودگی اور دکھ کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ ایک ایسا کرب ہے جو سنجیدہ تخلیقی ریاضت کے باوجود، بے شناخت رہ جانے کی نفسیاتی اور ذہنی کشمکش کے نتیجے میں، تخلیق کار کو ایک frustation میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہیں سے تخلیق کار کے یہاں خود سے فرار اور خودفراموشی اور خود اذیتی کے احساسات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ مگر اس سچ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ تخلیق کار ہر عہد میں ادب کی ضرورت ہوتے ہیں، ظفر گورکھپوری کا شمار ایسے ہی تخلیق کاروں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے ادب کا چہرہ بدلنے میں قابلِ ذکر contribution کیا ہے۔

ظفر گورکھپوری نے اپنا تخلیقی سفر، ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر سخت اصول وضوابط کی روشنی میں شروع کیا لیکن دورانِ سفر ترقی پسند تحریک کے زوال کا منظر بھی انہوں نے

اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ترقی پسند تحریک سے انحراف کے نتیجے میں نمو پزیر جدید شعری رجحانات کے زیرِ اثر اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ظفر گورکھپوری اپنے مخصوص لب ولہجے کے سبب نئی شاعری کی شناخت کا حوالہ بن گئے۔ مگر میرے نزدیک ظفر گورکھپوری کی شاعری کے قد کی سمائی کسی بھی تحریک کے فریم میں ممکن نہیں۔

ادب ہر دور میں تغیر پزیر رہا ہے اور کسی بھی زبان کے ادب کے ارتقاء کے لئے یہ ایک فطری عمل ہے، اور ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی سطح پر فکر واحساس اور اسلوب کی سطح پر تبدیلیاں شعوری یا غیر شعوری طور پر جاری رہتی ہیں۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ''تیشہ'' سے لے کر'' آر پار کا منظر'' تک فکر واظہار، زبان وبیان، اسلوب اور لب ولہجے میں واضح تبدیلیاں محسوس کی جا سکتی ہیں، دیگر ترقی پسند شعراء کی طرح ان کے یہاں بھی ''تیشہ'' میں گھن گرج، احتجاج، بغاوت اور سیاسی موضوعات پر اشعار کی تعداد قابلِ ذکر ہیں۔

دو چار کے حصّے میں مہکتی ہوئی صبحیں
اور رات کے سینے کا دھواں سب کے لئے ہے

قاتل اس شہر میں پھرتا رہے شمشیر بکف
اور گنہگار نہ کہلائے یہ قصّہ کیا ہے

دھواں، شمشیر، قاتل، جور وستم، ظلم، زنداں، دار ورسن، زنجیر، انگارے، آشفتہ سر، آہ وفغاں، کرب، دیدہ ءسرخ، بھوک، جنون، غم، تشدد، جبر، زخم، شعلے، تیرگی، پیلا چاند، شرارہ وغیرہ ایسے استعارے ہیں، جو ظفر گورکھپوری کی شاعری کے ابتدائی نقوش مرتب کرنے میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ مگر ترقی پسند شاعری کے مخصوص موضوعات اور لب ولہجے سے قطعِ نظر، ظفر گورکھپوری کے یہاں فکر واظہار کی سطح پر

www.urduchannel.in

تنوع کا احساس ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر میں ''وادیٔ سنگ'' اور ''گوکھرو کے پھول'' کے مسائل ومصائب اور کھردرے تجربات ومشاہدات سے گزر کر ''چراغِ چشمِ تر'' کے صبر آزما ذاتی کرب اور رنج وغم کے گھنے جنگل سے ثابت وسالم نکل آنے کے بعد ''آرپار کے منظر'' کے چشم دید گواہ بن گئے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے مطابق ظفرؔ گورکھپوری کی غزلوں میں شدتِ رنج ومحن عشرتِ شامِ غم بن گئی ہے۔ یوں لگتا ہے سرخوشی اور سرمستی کے بجائے دکھوں کی سوغات پاکر ظفر گورکھپوری نے یہ فیصلہ کیا ہو کیوں نہ ان ذاتی احساسات کو غیر ذاتی بنادیا جائے اور یہی وہ موڑ ہے جہاں اپنی شامِ واقعہ کے دکھ سے نڈھال فنکار دوسروں کے تجربات کا عکاس بن کر فن کی بارگاہ میں حضوری اور اپنے غم سے نجات پالیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی اس گراں قدر رائے کی روشنی میں ظفرؔ گورکھپوری کی شاعری کا مطالعہ کریں کہ چراغِ چشمِ تر اور اس کے فوراً بعد کی شاعری میں ان کے ذاتی رنج و غم کا اظہار ہے مگر انہوں نے اپنی تخلیقی ہنرمندی سے اسے غم دنیا بنا کر پیش کردیا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ظفرؔ گورکھپوری نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو محض اپنے غموں اور دکھوں سے نجات کے وسیلے کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ وہ اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات، عصری مسائل ومصائب، بکھرتے ٹوٹتے انسانی رشتوں اور زوال پزیر تہذیبی قدروں کو اپنی شاعری کے مرکز ومحور میں رکھا ہے۔

ممبئی جیسے تیز رفتار شہر میں کئی دہائیوں تک قیام پزیر رہنے کے باوجود ظفرؔ گورکھپوری ممبئی کی تہذیب اور شہر کی بھیڑ بھاڑ کا حصہ کبھی نہ بن سکے اور نہ ہی ممبئی سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہو سکے۔ اپنی شاعری کی طرح وہ بھی تمام عمر زندگی سے مکالمہ کرتے رہے اور ممبئی سے کسی حد تک بیزار ہونے کے باوجود انہوں نے ممبئی کو چھوڑنے کا ارادہ کبھی نہیں کیا۔

سالم تھا اپنے گاؤں کی کچی سڑک پہ میں
سڑکوں میں کس نے بانٹ دیا ممبئی سے پوچھ

آدھی صدی سزا کی طرح کاٹ کے ظفر
اب ممبئی سے اٹھ کے کدھر جایئے گا آپ

گھر، سفر، زندگی، سمندر، سورج، ریت، صحرا جیسے الفاظ ان کے یہاں کلیدی استعارات کی حیثیت رکھتے ہیں اور بڑی حد تک ان کے تخلیقی منظر نامے کو خلق کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ ہر تخلیق کار کے یہاں ایک مخصوص ڈکشن اور کچھ ایسے استعارات ضرور ہوتے ہیں جو مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ ظفرؔ گورکھپوری کے یہاں ''گھر'' ایک ایسا استعارہ ہے جو اپنی مٹی اور زمین سے ان کے جذباتی اور فکری رشتے کو نئے زاویوں سے منعکس کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمارا گھر بھی یہاں تھا کرے گا کون یقیں
کہ مٹھیوں میں ہماری غبار بھی تو نہیں

بے تحاشہ میں ترے گھر کی طرف بھاگا ہوں
ان مشینوں نے ذرا دیر جو مہلت دی ہے

گھر میں پہنچوں گا تو سب گٹھری ٹٹولیں گے مری
آنکھ میں چبھتی ہوئی گردِ سفر دیکھے گا کون

www.urduchannel.in

شاید اب تک مجھ میں کوئی گھونسلہ آباد ہے
گھر میں یہ چڑیوں کی چہکاریں کہاں سے آ گئیں

وہ دستکیں تھیں بیٹھ نہ پائے سکون سے
اک گھر دیا تو اس کو بھی پابندِ در کیا

محوّلہ بالا اشعار میں دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ظفرؔ گورکھپوری یہاں گھر کا لفظ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے اور گھر کے لغوی معنی سے الگ ایک نیا جہانِ معنی خلق کرنے میں کامیاب ہے۔ گھر ظفرؔ گورکھپوری کی یہاں جائے سکون بھی ہے اور جائے اماں بھی۔ گھر اپنے پیاروں سے گہری وابستگی کا حوالہ بھی ہے اور چڑیوں کی چہکاروں سے روشن آشیانہ بھی۔ انہیں گھر کے پابندِ در ہونے کی شکایت بھی ہے اور سفر سے گھر واپسی پر اپنی کم مائیگی پر افسوس بھی۔

ظفرؔ گورکھپوری کے یہاں گھر کی طرح زندگی کا لفظ بھی ان کی شاعری کا معتبر حوالہ ہے۔ وہ زندگی کے تجربات اور محسوسات نیز اپنے دکھوں اور غموں کو زندگی کے استعارے کی مدد سے نہایت خوبصورتی سے بیان کرنے پر قادر ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

زندگی نے دے کے محسوسات کی دولت مجھے
کیسی کیسی برچھیاں رکھ دی ہیں سانسوں کے قریب

مداریوں کا تماشہ ہے زندگی میری
کھڑی ہیں گھیر کے جھوٹی شہادتیں مجھ کو

زندگی دی ہے مجھے آگ کے دریا کی طرح
پار اترنے کے لئے موم کی کشتی دی ہے

زندگی میری ہے سناٹے کا پیڑ
چہچہاتی کوئی چڑیا بھیج دے

ان اشعار میں ظفرؔ گورکھپوری نے زندگی کے سفاک اور کرب ناک چہرے کو بیک وقت اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ ظفرؔ گورکھپوری کی شاعری ایک ایسے انسان کا سفر نامہ ہے جو ایک طرف ممبئی جیسے برق رفتار شہر میں اپنے survival کے لئے وجود کی لڑائی لڑ رہا ہے دوسری طرف اپنے ذاتی مسائل و مصائب سے بھی نبرد آزما ہے۔ وہ تنہائی، مایوسی، تشدد، بے یقینی اور بے زمینی کی اذیتوں کا شکار بھی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ ظفرؔ گورکھپوری نے اپنے زخموں سے روشنی کشید کر کے اپنی شاعری کو ایک بالکل نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ ترقی پسند ناقدوں کی تمام تر بے توجہی کے باوجود، جدید شاعری کے منظر نامے پر ظفرؔ گورکھپوری ایک لیجینڈ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

عطا عابدی۔زخم،زندگی اور خواب کا شاعر

عطا عابدی کا تعلق ۱۹۸۰ء کے بعد نمایاں طور پر ایوانِ ادب میں اپنی موجودگی درج کرانے والی اس ادبی نسل سے ہے جس نے جدیدیت کے زوال کے بعد مابعد جدید تخلیقی رجحانات کے زیرِ اثر اپنا تخلیقی سفر شروع کیا ہے۔عطا عابدی کے لئے شاعری محض تفننِ طبع کا سامان نہیں بلکہ ان کے لئے تخلیقی عمل ذہنی اور باطنی آسودگی اور سرشاری کا وسیلہ ہے،وہ ایک عمدہ نثر نگار اور نقاد بھی ہیں اور ادب میں صحت مند تنقیدی رویوں کے طرف دار بھی۔

اپنے اولین شعری مجموعے ''بیاض کے دیباچے'' میں انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ''شاعری میرے لئے نہ جنون ہے نہ ذہنی تشنگی کے لئے آبِ حیات۔شاعری میرے لئے عشق ہے اور عشق ہزار جلووں کی پناہ گاہ''۔عطا عابدی کی شاعری کو ان کے اسی منشور کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی سوچ کے کینوس پر زندگی،غم سے نجاتِ غم تک۔تلخ و شیریں تجربات و محسوسات کے کثیر الجہت منظر نامے مصور کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ان کے مجموعے بیاض کی شاعری میں بعض ادب دوستوں اور تنقید نگاروں نے فہم و فراست اور دانشوری کے عناصر بھی ڈھونڈ نکالے ہیں،یہ بات کسی حد تک سچ بھی ہے مگر ''نوشتِ نوا'' کی شاعری کا مزاج

یکسر مختلف ہے کہ فطری شاعری ریاضی کا کوئی حساب نہیں بلکہ اس کا تعلق براہِ راست دل سے ہوتا ہے نہ کہ دماغ سے،چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

کرشمہ سازی بھی دانشوری کا حصّہ ہے
زمیں پہ چلئے مگر آسمان میں رہئے

ہمیں بھی زعم ہے دانشوری کے منصب کا
ہیں مبتلائے فریبِ خود آگہی ہم بھی

روشنی کی کاشت تھی مطلوب ہم سے اور ہم
تیرگی کے شہر میں دانشوری کرتے رہے

پناہ دانشوروں سے مانگے
رہے سلامت جنون میرا

ہوئی سجدہ کناں دانشوری بھی
بھروسہ کچھ نہیں دل کی ادا کا

یہ سارے اشعار عطا عابدی کے اولین شعری مجموعے بیاض میں شامل ہیں جوان کے فکری نہج کا پتہ دیتے ہیں۔ان کے شعری مجموعے ''نوشتِ نوا'' میں ان کی شاعری کا ایک دوسرا پہلو ہی ہمارے سامنے آتا ہے ان کے یہاں تخلیقی سطح پر زندگی کے ردّ و قبول اور اس کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اپنے زخموں سے روشنی کشید کرنے کا عمل شدید ہے۔اس کے علاوہ ان کے یہاں اپنے زخموں اور آنسوؤں سے توانائی حاصل کر کے انہیں اپنے اشعار میں منوّر کرنے کی حوصلہ مندی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

www.urduchannel.in

عطا عابدی کی شاعری پر اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر کوثر مظہری نے لکھا ہے کہ ان کا شعری مزاج غم آگیں ہے جو معصوم احساسات سے تعمیر ہوا ہے یہ بات کسی حد تک سچ ہے مگر میرے نزدیک عطا عابدی کی شاعری میں قنوطیت اور مایوسی کے عناصر کم کم ہی پائے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں تمام طرح کے مسائل و مصائب کے باوجود زندگی کرنے کا حوصلہ ہے، اس ضمن میں حقانی القاسمی نے ان کی شاعری کی رائے بے حد اہم ہے کہ ”عطا عابدی کو اپنی ذات کا عرفان اور شعور ہے، اپنی جڑوں سے وابستگی نے ان کے شعری کردار کے دائرہ کو محدود نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے مختلف زاویوں کو سمجھنے اور متشکّل کرنے کے لئے مہمیز کیا ہے“۔

”نوشتِ نوا“ کی شاعری کا سنجیدہ مطالعہ ہمیں ان کے یہاں موجود متعدد شعری رویوں اور زندگی سے ان کے انسلاکات سے آشنا کرتا ہے، وہ اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو بھی ایسی تخلیقی ہنرمندی سے مصوّر کرتے ہیں کہ وہ ان کی شاعری میں عصری شعور و آگہی سے ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں۔ عطا عابدی کے یہاں زندگی، زخم، خواب اور سفر ایسے ترجیحی الفاظ ہیں جو ان کی شاعری کی عمومی فضا قائم کرتے ہیں۔

کیا خبر تھی جذبۂ عیش و طرب لے جائے گا
زندگی کا غم مرا ذوقِ ادب لے جائے گا

زندگی سمجھا کئے سانس ہی لینے کو فقط
یہ تدبیر مگر خود کو گنوانے کی ہوئی

لاکھ طوفان ہو، سوتے ہی نہیں
زندگی ہم تجھے کھوتے ہی نہیں

ادائیں تیری حسیں ہیں مگر ہمارے لئے
کچھ اور بھی تجھے اے زندگی نکھرنا ہے

خواب ہی خواب کی تعبیر ہوا تو جانا
زندگی کیوں کسی آنکھوں کے اثر میں آئی

کسے میں چاند کسے اس کا داغ دکھلاؤں
جو ہم سفر تھا وہی ہم سفر نہیں ٹھہرا

سفر کرنے لگی ہے آج منزل
مسافت رہ گزر کی بڑھ گئی ہے

اے زیست نہ ہم پر احسان تو ہونے کا
پایا ہی نہیں جب کچھ، کیا ڈر ہمیں کھونے کا

مسیحا کی یہ صحبت راس آئی
شمار اب اپنے زخموں کا نہیں ہے

www.urduchannel.in

پسند کیوں نہ ہو زخموں کی تازگی مجھ کو
انہیں گلوں سے عطا دل مرا بہلتا ہے

ان اشعار میں عطا عابدی کے مختلف تخلیقی اور فکری رویوں کی جھلک ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے ۔وہ زندگی سے براہِ راست مکالمہ کرتے ہیں اور اپنے زخموں اور غموں سے توانائی حاصل کر کے زندگی کے مسائل ومصائب سے نبرد آزما رہتے ہیں ۔
یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں محض آنسو،زخم ،درد اور اپنے ماضی کے درد آشنا لمحوں کو کریدنے کا ہی عمل نہیں ہے بلکہ خوشیاں اور اور مسکراہٹ بھی ان کی شاعری کے لئے خام مواد فراہم کرتے ہیں ۔یہ بات صحیح ہے کہ سکہّ بند اور نام نہاد ناقدینِ ادب نے نئی نسل کے جینوئن تخلیق کاروں کو بھی توجہ سے پڑھنے کی زحمت نہیں کی ورنہ عطا عابدی جیسے شاعر ہماری عصری شاعری کا معتبر حوالہ ہوتے ۔

☆☆☆

موجِ خیال کا فکری اور تخلیقی نظام

جاوید ندیم کا تعلق ۱۹۸۰ کے بعد ایوانِ ادب میں نمایاں طور پر اپنی موجودگی درج کرانے والی نسل سے ہے ۔غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے تاہم نظم کے پیرایہ میں بھی انہوں نے اپنی تخلیقی فکر کا اظہار نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے ۔
موجِ خیال جاوید ندیم کے ان فکر پاروں پر مشتمل ہے ،جو انہوں نے ۱۹۸۵ سے ۲۰۰۰ کے دوران قلمبند کئے ہیں ۔جاوید ندیم نے اگر چہ موجِ خیال کے فکر پاروں کو نثری نظم کے پیرایہ میں لکھا ہے لیکن نشتر خانقاہی نے کتاب کا دیباچہ لکھتے وقت ان تحریروں کو نثری نظم کہنے سے عمداً گریز کیا ہے ،اور اس کا جواز یوں پیش کیا ہے ۔
’’موجِ خیال کے مندرجات ادب لطیف کے پیرائے میں لکھے جانے والے انشائیے نہیں ہیں ،یہ لفظی سطح پر صرف نثر پارے بھی نہیں بلکہ خیال پارے ہیں یہ کسی مصنف کے فرصت کے اوقات میں لکھی گئی ڈائری نہیں ہے بلکہ فکریات کا وہ اظہار ہے جو کوئی نہ کوئی تجربہ ،تجزیہ ،کوئی نہ کوئی ترغیب ،تشخیص یا تسکین لے کر سامنے آتا ہے لیکن کہنے والے کو معلّم بنا کر نہیں ،یوگی یا رشی بنا کر پیش کرتا ہے ۔سب جانتے ہیں کہ رشی کا لہجہ معلم کے لہجے سے الگ ہوتا ہے ،معلم کے لہجے میں لفظ کی ساختیاتی جمالیاتی ہوتی ہے اور رشی کے لہجے میں لفظ کی روحانی جمالیات ۔یہی وہ عنصر ہے جو جاوید ندیم

www.urduchannel.in

کے خیال پاروں کی نثر کو عام نثر سے الگ کر کے اسے محض شعری حسن کے نزدیک ہی نہیں لاتا بلکہ اس روحانی جذب وانجذاب سے آشنا بھی کرتا ہے جس سے قاری کی تسکین تو ہوتی ہے تطہیر بھی ہوتی ہے۔"

اس بحث سے قطعِ نظر کہ "موجِ خیال" میں شامل تحریروں کو ناقدینِ شعر و ادب شاعری کے خانے میں رکھیں گے یا پھر نثر کے خانے میں یا پھر وہ کون سے عوامل ہیں جو ان تحریروں کو نثری نظم کی حدود میں داخل ہونے سے روک دیتے ہیں ،ہم ان تحریروں کی فکر کے داخلی نظام پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ موجِ خیال میں جاوید ندیم اپنی فکر و جذبے کی شدت اور احساس کے سیلاب کے سبب اپنی غزلوں سے یکسر مختلف نظر آتے ہیں۔ان کی غزلوں میں موجودہ مسائل و مصائب اپنے تمام تر سیاسی ،اخلاقی ،معاشی اور تہذیبی بھی مظاہر کے ساتھ روشن ہوتے ہیں جب کہ موجِ خیال میں ان کا اندازِ فکر بے حد گمبھیر ہو گیا ہے،ان کے مادی اور روحانی زندگی کے درمیان کشمکش اور تضادات ،خود کو دریافت کرنے کی کوشش ،اخلاقی قدروں کے زوال کے اسباب اور موت وحیات کے فلسفے کو سمجھنے کا عمل شدید تر ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جاوید ندیم ادب میں مقصدیت کے طرف دار اور اپنی تحریر حرف حرف زندگی میں لکھتے ہیں۔

"ادب کا اولین مقصد تو اظہارِ حق اور حمایتِ حق ہے"

جاوید ندیم کے یہاں یہ احساس بھی شدید ہے کہ آج جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے وہ بے مقصد اور بے روح ہے کیونکہ ہماری زندگی عدم مقصدیت کا شکار ہو گئی ہے،جن کے اسباب درج ذیل ہیں۔

ا۔آج ہمارے پاس جذبہ ہے،نہ فکر نہ اظہار کرنے والے الفاظ۔

۲۔ہم اپنے محسوسات اور مشاہدات کو اپنے ادراک کا حصّہ بنائے بغیر ہی اگل دیتے ہیں۔

۳۔ہم باطل نظریات اور پرانے خیالات کے تخمِ خام سے اپنی زمینوں میں فصل اگانے میں مصروف ہیں۔

اپنے مضمون نثری نظم کا مسئلہ میں نعمان شوق نے بھی شاعری سے غائب ہوتے استعارات وتشبیہات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

ان دنوں اچھی شاعری کا قحط اس لئے بھی ہے کہ ہم سب صارفی تہذیب consumer culture کا حصّہ بنتے جا رہے ہیں آج کل انسان حتیٰ کہ اس کے جذبات و احساسات کی حیثیت بھی product کی سی ہو گئی ہے ،یہ صورتِ حال انسانیت کے لئے بہت خطرناک ہے۔

صارفی تہذیب کی اس خطرناک صورتِ حال کو جاوید ندیم نے بھی نہایت سنجیدگی سے محسوس کیا ہے،ان کے مطابق آج پوری دنیا ایک منڈی بن گئی ہے اور تہذیب و الفاظ بازاری ہو گئے ہیں۔آج جب کہ مابعد جدید شعری تناظر میں غیر مشروط ذہنی وابستگی اور تخلیقی اظہار کی مکمل آزادی کی حمایت میں ایک پوری نسل کھڑی ہے۔جاوید ندیم یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ کیا ادب کی حیثیت زندگی کے ڈرائنگ روم میں رکھے ایک خوبصورت گلدان کی سی ہے جو صرف ہماری جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے رکھا گیا ہے ،وہ ادب کی تخلیق کے حوالے سے یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ہر شاعر و ادیب کا زندگی اور ادب کے تعلق سے ایک نظریہ ہونا چاہیے۔اس ضمن میں جاوید ندیم نے اپنی صحت مند نظریاتی اور ذہنی وابستگی کے حوالے سے مادی اور روحانی زندگی کے مابین کشمکش اور تضادات کو سمجھنے کی نہایت مخلصانہ اور ایماندارانہ کوشش کی ہے جو یقینی طور پر لفظ کی روحانی جمالیات تک رسائی کا موثر وسیلہ ہے۔ان کے فکر پاروں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

☆ زندگی مسائل سے عبارت ہے اور خود ایک مسئلہ ہے
اور اس کا سبب ہماری ضروریات کی بے ترتیب عمومیت

www.urduchannel.in

ہماری جو ضرورتیں نہیں ہیں انہیں زندگی سے نکال دیں
اور ضرورتوں کو ان کا جائز مقام دیں۔
پھر زندگی مسئلہ نہیں بن پائے گی ...... صفحہ ۴۹

تمہاری یہ زندگی
(پیدائش سے موت تک)
کیا مکمل زندگی ہے
نہیں یہ تمہاری زندگی کا لمحہ بھر ہے
مجھے افسوس ہے
کہ آکاش کی حدوں کو چھونے والا انسان
ابھی تک اپنی ذات کی بلندیوں کو نہیں چھو پایا

میں سوچتا ہوں
زندگی کی سانسوں نے
میرے بدن کو حدّت کے سوا کیا دیا ہے؟
دھرتی پر ایک بوجھ سے زیادہ نہیں رہا میرا وجود
آ کر دھرتی کب تک میرا بوجھ برداشت کرے گی؟
وقت آ گیا ہے کہ موت مجھے گلے لگا لے
میں دھرتی کا بوجھ کم کرنا چاہتا ہوں
یا زندگی کے بوجھ سے خود چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ صفحہ ۹۰

جاوید ندیم زندگی کے مختلف رنگوں کو اپنی تخلیقی سوچ کا حصّہ بناتے ہیں وہ اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر فکر و احساس کے موتی نکالتے ہیں۔ اپنے فکر پاروں کی تخلیق

میں ان کا لہجہ کہیں خود کلامی کا ہے اور کہیں خطیبانہ، وہ زندگی کی بے ثباتی اور موت کے بعد ابدی زندگی کی سچائیوں سے محوِ گفتگو ہیں، انہیں احساس ہے کہ دنیا کی ساری سہولتیں اور آسائشیں اور مادی ترقی حاصل کرنے والا انسان، دراصل اپنی موت کی حقیقت سے ناواقف ہے، وہ اپنے اندر کی روشنی اور تاریکیوں کا محاسبہ کرنے سے چشم پوشی کرتا ہے۔

جاوید ندیم لفظ کی قوت پر اصرار کرتے ہیں، لفظ جو منتر ہے، لفظ جو خدا کی اولین تخلیق اور عظیم نعمت ہے۔ ان کے یہاں لفظ زندگی کے مختلف رنگوں کو تصویر کرنے کا وسیلہ ہے، لفظ کی قوت اور عظمت کا اعتراف معروف جدید شاعر جینت پرمار نے بھی کیا ہے۔

مصرعوں کے پیوند لگے
کاغذ کو پہنے
نظموں کے نکڑ پہ کھڑا
تاروں کی تسبیح لئے ہاتھوں میں
ایک بوڑھا شاعر
اب بھی اسی امید میں کہ
روح کے اندھیارے سے
صرف بچا سکتے ہیں لفظ..............(نظم شاعر جینت پرمار)

لفظ جب تخلیقی صداقتوں کے حوالے سے نمو پزیر ہوتے ہیں تو روح کے اندھیرے سے نجات کا سبب بن جاتے ہیں۔ جاوید ندیم کے یہاں، درخت، بیل، پھول، پھل، سمندر وغیرہ الفاظ ایسے کلیدی استعارے ہیں جن کی مدد سے انہوں نے اپنی موجِ خیال کے فکری نظام کو کئی دشاؤں میں روشن کیا ہے۔

www.urduchannel.in

کلہاڑی نے درخت سے دستہ حاصل کیا
اور قوت پالی
اور پھر
اسی دستے کی مدد سے درخت پر حملہ کردیا
درخت نے امربیل کو زندگی دی
نمو بخشی
اور امربیل نے
اسے کیا دیا
استحصال
درخت کی شاخیں
روشنی کی طرف بڑھتی ہیں
تو جڑیں نمی کی طرف
تمہارا قرب
میرے نفس کی تسکین
تمہارے دل میں میری خواہش
ایک طلب تمہارے وجود کی
مرد درخت ہے
عورت بیل
بیل کی بقا کے لئے درخت کا وجود
اتنا ہی ناگزیر ہے
جتنے روشنی اور آب

☆ بیویاں تو بیل ہیں
اور بیل
درخت کو جکڑ لیتی ہیں

☆ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے
اور پھل اپنے درخت سے
نیکی بدی ایک معیار ہیں، تمہاری شناخت کا

موجِ خیال کی تحریروں کے ان اقتباسات میں جاوید ندیم نے انسان کی فکری جبلتوں، ضرورتوں اور فطری رشتوں کو درخت اور بیل کے استعاروں کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ موجِ خیال کے مطالعے کے دوران جب ہم ان فکر پاروں سے گزرتے ہیں جو زمانی اعتبار سے ۱۹۹۵ کے بعد تحریر کئے گئے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں جاوید ندیم کا لہجہ، ڈکشن اور اندازِ تخاطب بالکل مختلف نظر آتے ہیں، یہاں وہ اپنی جڑیں اسلامی روایات کی تہذیبی زمینوں میں تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے خود تحریر کیا ہے کہ ادبی نقطۂ نظر سے قرآن کے اسلوب اور تمثیلی اندازِ تخاطب نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہی اندازِ تخاطب اور اسلوب ان کے کئی فکر پاروں میں نظر آتا ہے۔

وہ کبھی ایک عابد کی طرح خود سپردگی کی لذتوں سے سرشاری کا لطف اٹھاتے ہیں، کبھی مصلحِ قوم اور واعظ بن کر گناہ و ثواب، خیر و شر، علم و جہالت اور روشنی اور تاریکی کے درمیان فلسفیانہ اساس پر حدِ فاصل کھینچتے نظر آتے ہیں تو کبھی درویش، صوفی، قلندر اور رشی بن کر فقر و غنا اور انجذاب کی کیفیتوں سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ان کے بعض فکر پاروں میں ایک طرح کے استغراق اور محویت کا احساس ہوتا ہے، جس کے سبب ان کے یہاں کئی فکر پارے الہامی کیفیت کے حامل ہوگئے ہیں۔

www.urduchannel.in

علم؟
صداقت کے حصول کا ذریعہ ہے
آ گہی
سرور و انبساط
اور گمرہی ہے، وہ علم
جس میں صداقتِ کاملہ کی
جستجو نہ ہو
شیطان کے ہتھیاروں میں ایک ہتھیار یہ بھی ہے
کہ وہ
عابد کو خوش فہم
زاہد کو متکبر
اور عالم کو مغرور بنا دیتا ہے
تم خود کو دوسروں سے مافوق سمجھتے ہو
یہ جذبہ تمہاری عبادات کو دیمک کی طرح چاٹ جائیگا
خدا نے اپنی جن نعمتوں سے تمہیں سرفراز کیا ہے
کیا ان میں فقراء اور مساکین کا حق نہیں
تم نے اپنے علم اور وسائل کو راہِ خدا میں کتنا صرف کیا؟
اور کیا یہ دعوتِ حق تمہارا ذمہ نہیں

☆☆☆

نئ تنقیدی جہات۔ایک جائزہ

عبدالمتین جامی اڑیسہ کے قابل ذکر قلم کار ہیں، وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور غزل کے علاوہ رباعیات ان کی تخلیقی ریاضت کا حصہ ہیں۔اب تک ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ نشاطِ آگہی کے نام سے منظرِ عام پر آ چکا ہے جبکہ ان کی رباعیات کے دو مجموعے بساطِ سخن اور مونسِ سخن کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، جس سے انکی شعری اور تخلیقی دلچسپیوں کا پتہ چلتا ہے۔ان کی نئ کتاب ''نئ تنقیدی جہات'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس سے ان کے نثری رجحانات کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ انکے تنقیدی رویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

''نئ تنقیدی جہات'' میں شامل مضامین کی نوعیت مختلف ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عبدالمتین جامی ایک کثیر المطالعہ شخص ہیں اور ان کی دلچسپیاں شاعری کے علاوہ نثر سے بھی گہری ہیں اور وہ ادب میں نئے تخلیقی تجربات، رجحانات اور تحریکات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔کتاب میں شامل پہلا مضمون ''جدیدیت، مابعد جدیدیت'' ہی میری اس رائے کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کا تصور مغرب میں اگرچہ خاصا پرانا ہے مگر برصغیر میں یہ رجحان ذرا دیر سے

www.urduchannel.in

آیا۔ مابعد جدیدیت اور جدیدیت میں واضح فرق ہے جسے ہندوستان میں اس کے بنیاد گزاروں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور نظام صدیقی وغیرہ نے بہتر انداز سے سمجھایا ہے خصوصاً ۱۹۸۰ء کے بعد کی جانے والی شاعری میں جدیدیت کے دور کی شاعری کے مقابلے فکر واحساس کی سطح پر زیادہ تازہ کاری محسوس کی گئی، شاید اسی لئے اسے مابعد جدیدیت سے موسوم کیا گیا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے ادب میں فرد کی تنہائی، بکھراؤ، تشکیک، بے یقینی، بے چہرگی اور بے زمینی سے آگے فکر واظہار کی آزادی اور کھلے پن پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ عبدالمتین جامی نے اپنے اس مضمون میں اردو کے مستند اور معتبر ناقدین کی آراء کے حوالے سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بنیادی اور موجودہ صورتِ حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مگر وہ خود اسے جدیدیت کی توسیع سمجھتے ہیں، جس سے ہمارے بہت سے اکابرینِ ادب اختلاف رکھتے ہیں ۔

اپنے ایک اور مضمون ''غزل نما کے بانی ظہیر غازی پوری اور آزاد غزل'' میں عبدالمتین جامی نے آزاد غزل اور غزل نما کے بنیادی محرکات اور ان اصناف کے امکانات اور موجودہ صورتِ حال پر عمدگی سے اظہارِ خیال کیا ہے یہ بات سچ ہے کہ آٹھویں دہائی میں آزاد غزل پر بہت مباحثے ہوئے بلکہ دیکھا جائے تو قلم کاروں کی پوری برادری ہی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، ایک آزاد غزل کی حمایت میں دوسری اس کی مخالفت میں۔ کئی رسائل نے آزاد غزل کی ترویج واشاعت میں اہم رول ادا کیا جن میں کوہسار بھاگلپور، اسباق پونے وغیرہ اہم ہیں، آزاد غزل کے کئی مجموعے بھی شائع کئے گئے، اس کی حمایت اور مخالفت میں ڈھیر سارے مضامین شائع کئے گئے، بے شمار مباحث ہوئے ، یہاں تک کہ پابند غزل کی مخالفت میں بھی باقاعدہ تحریک چلائی گئی۔ مگر اب موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ آزاد غزل اور غزل نما سے لوگوں کی دلچسپی تقریباً ختم ہے جبکہ پابند غزل کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوا ہے اور اس نے اپنا دائرہ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں تک وسیع کیا ہے۔ آزاد غزل جس میں ہر

مصرع بحر میں ہوتے ہوئے بھی مساویٔ الوزن نہیں ہوتا، جب کہ غزل نما میں ہر شعر کے دونوں مصرعے مساویٔ الوزن ہوتے ہیں۔ یہی فرق ہے آزاد غزل اور غزل نما کے فارمیٹ میں ۔عبدالمتین جامی نے اپنے اس مضمون میں تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے کئی متنازعہ فیہ باتیں بھی لکھ دی ہیں۔ مثلاً ''ظہیر غازیپوری نے اگر چہ اپنے چند احباب و مدیر کوہسار کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی پابند غزلوں کی شکل بگاڑ کر آزاد غزل لکھنے کی ابتدا کی مگر ان کی یہ کوشش تین چار غزلوں سے آگے نہیں بڑھی، بعد میں موصوف نے غزل نما کی تخلیق کا آغاز کیا جس کی ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ہوئی۔'' یہاں اس بات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے کہ ظہیر غازیپوری نے جو آزاد غزلیں لکھی ہیں وہ دراصل ان کی پابند غزلوں کی بگڑی ہوئی شکل ہے، میرے خیال میں ایسا محض اس بنیاد پر کہا گیا ہوگا کہ بعد میں ان کی آزاد غزلوں بشمول مظہر امام پابند غزلوں میں کامیابی سے تبدیل کردیا گیا۔

شفق کے ناول ''کانچ کا بازیگر'' کا مطالعہ کرتے ہوئے عبدالمتین جامی نے نہایت عرق ریزی کر کے اس ناول کے محرّکات ور مضمرّ ات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ملک کی تقسیم کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناول کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ ''شفق کے ناول کو پڑھنے سے قبل قاری کو اپنے ذہن میں امیج یا علامت کو قبول کرنے کا موڈ پیدا کرنا ضروری ہے، تبھی جا کر صحیح لطف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ محض خالیٔ الذہن ہو کر اس کے مطالعے میں کوئی لطف نہیں آئے گا۔ شفق کی علامتیں عجیب وغریب ہیں، مگر مافوق الفطرت ہستیاں ہر گز نہیں ہیں۔ ہمارے ہی معاشرے میں چلتے پھرتے مختلف لوگ ہیں جو مختلف اوقات میں مصنف کے ذہن میں بدلی ہوئی شکلوں میں ابھرتے ہیں۔''

سعید رحمانی کی شاعری پر شامل مضمون میں عبدالمتین جامی نے ان کی شاعری کا عروضی مطالعہ کیا ہے جو ایک خوش آئند امر اس اعتبار سے بھی ہے کہ اب ہماری نئی نسل کے شعراء میں عروض سے دلچسپی بہت کم ہوتی جارہی ہے جو یقینی طور پر ایک افسوسناک

www.urduchannel.in

صورتِ حال ہے۔اس مضمون میں عبدالمتین جامی نے روشن عبارت کی غزلوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سعید رحمانی کی شاعری میں ایک طرح کی سادگی اور پُرکاری ہے،شاعری کی گرامر اور فنی باریکیوں پر وہ خاصی دسترس رکھتے ہیں اس کے علاوہ یہ انکشاف کرنے میں وہ حق بجانب ہیں کہ سعید رحمانی کے یہاں بعض اوقات شعروں میں ایسے مضبوط مصارع بھی ظہور پزیر ہوتے ہیں جو اپنے طور پر ہی مکمل خیال کو ادا کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔اپنی اس رائے کے ثبوت میں انہوں نے کئی بہترین مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

میرے نزدیک زیرِ نظر کتاب کا سب سے اہم مضمون ''جدید تر شاعری کی چند معتبر آوازیں'' ہیں جس میں انہوں نے کئی مابعد جدید شعراء کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے،جن میں احتشام اختر،منیر سیفی،عالم خورشید،خاور نقیب،اظہر نیر،اور خاکسار یعنی سلیم انصاری پر مضامین ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام شعراء وہ ہیں جنہوں نے اپنی شعری شناخت ۱۹۸۰ء کے بعد قائم کی ہے،اور فکر و اسلوب میں یہ شعراء ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔مثلاً احتشام اختر کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے عبد المتین جامی لکھتے ہیں۔'' دراصل احتشام اختر کے اندر ایک ایسا شاعر موجود ہے جو حسن پرستی اور عشقیہ جذبات کے اظہار کو اپنی شاعری کا وسیلہ بنانے کا خواہاں ہے لیکن جدید ترقی یافتہ معاشرے کی مشینی زندگی اس کو ایسا کرنے سے باز رکھتی ہے،کیونکہ موجودہ عہد کے انسان کا مشینوں میں پسنا مقدر بن چکا ہے۔''

عبدالمتین جامی منیر سیفی کی شاعری میں ایک نیا زاویہ تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''منیر سیفی کے یہاں گھر کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔مگر ان کا گھر ہر جگہ ایک نئی علامت بن کر ابھرتا ہے۔کبھی اپنے گھر کے زمیں بوس ہونے کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔(یہ جدید انسان کا احساسِ بے حسی ہے)،کبھی اپنے گھر سے بیزار نظر آتے ہیں ،کبھی باہر کی دنیا سے اُوبھ کر گھر میں تلاشِ سکوں میں محو ہو جاتے ہیں۔دراصل شاعری

میں نئے امکانات و رجحانات اور نئی دشاؤں کو تلاش کرنا ہی تنقید کا منصب ہے مگر ان کے اس خیال سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے کہ خود اعتمادی کا فقدان جدید شعراء کی سب سے بڑی کمزوری ہے یہ صفت نہ ہی صرف شاعروں میں پائی جاتی ہے بلکہ ہر جدید انسان اس کمزوری کا شکار ہے۔میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں کہ جدید شعراء میں خود اعتمادی کا فقدان ہے۔میرے نزدیک سچ تو یہ ہے کہ آج کا شاعر انٹرنیٹ اور سائبر عہد کے گمبھیر مسائل و مصائب اور تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے باوجود شاعری میں نئے امکانات کے پھول کھلا رہا ہے۔عالم خورشید نئی نسل کے منفرد اور قابلِ ذکر شاعر ہیں ان کی غزلوں کا رنگ ہمعصر شعراء سے یکسر مختلف ہے،ان کے یہاں نامانوس الفاظ اور غیر مستعمل تراکیب کی مدد سے شعری لہجہ ترتیب دینے کی صلاحیتیں ہیں جس کا اعتراف ناقدینِ شعر و ادب نے بخوبی کیا ہے۔عالم خورشید کی شاعری پر عبدالمتین جامی کا مضمون قابلِ مطالعہ اور لائقِ توجہ ہے۔انہوں نے نہایت عرق ریزی سے عالم خورشید کی شاعری کے مختلف گوشوں پر نہ صرف خاطر خواہ گفتگو کی ہے بلکہ ان کی شاعری میں نئے رُجحانات اور میلانات نیز نئے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔خاور نقیب کی شاعری پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے انکی طویل نظم ''قلم فردوس'' کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس نظم کا کینوس وسیع ہے اور اس میں مترنم لہجہ،رجائی آہنگ اور فکری عناصر کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے،نیز اس نظم میں موجودہ مسائل و مصائب کی عکاسی بھی نہایت تخلیقی انداز میں کی گئی ہے۔

میرے نزدیک خاور نقیب عمدہ شاعر ہیں اور اپنی شاعری کے فکری اور اسلوبیاتی نظام کو جدید عہد کے مسائل سے ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

راقم الحروف یعنی سلیم انصاری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالمتین جامی لکھتے ہیں ''سلیم انصاری ہمارے عہد کے ایک معتبر شاعر ہیں۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ نظم و غزل دونوں ہی صنفوں پر کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے بلکہ انہوں نے نظم کے شاعری

www.urduchannel.in

حیثیت سے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔'' مصنف کے یہ حوصلہ افزا کلمات میرے لئے یقینی طور پر قابل، قدر ہیں جس کے لئے میں ذاتی طور پر ممنون ہوں۔

نئی تنقیدی جہات میں کئی اور مضامین شامل ہیں جن پر میں اپنی رائے اس تبصرے کی طوالت کے سبب نہیں دے رہا ہوں، ایسے ہی چند مضامین ہیں ترجمہ کا فن اور کرامت علی کرامت، ڈاکٹر نریش کی افسانہ نگاری، لاکلام کا شاعر۔ غلام مرتضیٰ راہی، مظفر حنفی کا ذہنی ارتقا۔ پرچمِ گرد باد کی روشنی میں، قمر جمالی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ، اڑیسہ میں اردو تقدیسی شاعری کی سمت ورفتار اور عزیز اندوری کی غزل گوئی شامل ہیں۔ ان تمام مضامین میں بھی عبدالمتین جامی نے نہایت عرق ریزی سے اپنے مطالعاتی ذہن اور تجزیاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی بے باک رائے کا اظہار کیا ہے جس کے لئے وہ یقینی طور پر قابل، مبارک باد ہیں۔ چونکہ وہ بذاتِ خود تخلیق کار ہیں اور تخلیقی عمل کے رموز اور آداب سے واقف ہیں لہٰذا غیر جانب داری سے تنقید کا منصب نبھانے میں کامیاب رہے ہیں۔

☆☆☆

''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' پر ایک نظر

ادھر گذشتہ چند برسوں میں اردو میں کئی قابلِ ذکر اور اہم ناول منظرِ عام پر آئے ہیں جن میں غضنفر کا 'مانجھی'، مشرف عالم ذوقی کے دو ناول 'لے سانس بھی آہستہ' اور 'آتشِ رفتہ کا سراغ'، رحمان عبّاس کے تین ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' اور 'نخلستان کی تلاش' پیغام آفاقی کا 'پلیتہ' شائستہ فاخری کا 'فسوں' اور زیرِ مطالعہ نورالحسنین کا ناول 'ایوانوں کے خوابیدہ چراغ' اپنے موضوع ،تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے اعتبار سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں اور موجودہ عہد میں ناول نگاری کے فن میں ایک نئے باب کا آغاز کرتے ہیں۔

''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' نورالحسنین کا ۱۸۵۷ء کی جدّ وجہدِ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے جس میں بقول مصنّف تاریخی واقعات کی صحت کا حتی المقدور خیال رکھا گیا ہے اور ان تاریخی واقعات اور historical content کی صحیح رپورٹنگ کے لئے دلّی کے قدیم روزنامچوں اور تاریخی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تاریخی موضوعات پر بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ قابلِ مبارکباد ہیں نورالحسنین کہ انہوں نے اس موضوع کا انتخاب کیا اور ایک ایسا ناول لکھنے میں کامیاب ہوئے جو نہ صرف تاریخی اعتبار سے بلکہ اپنے اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے بھی ایک عمدہ اور بہترین ناول کے تمام تقاضوں اور اصولوں پر کھرا اترتا ہے۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ میں نورالحسنین نے بیانیہ اسلوب اختیار کیا ہے مگر ناول میں استعارات کی مدد سے ایک نیا تخلیقی منظر نامہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں وہ

www.urduchannel.in

پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک ماضی کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں کو فکشن کی شکل میں پیش کرنا نہایت مشکل کام ہے مگر بقول مشرف عالم ذوقی 'اس ذمے داری کو وہی قبول کرسکتا ہے جو ماضی کے استعارے سے ہر ممکن تخلیقی امکانات کو ناول کا موضوع بنانے میں مہارت رکھتا ہو اور یہ کام نورالحسنین نے بخوبی انجام دیا ہے۔

اس ناول میں مصنف نے ۱۸۵۷ اور اس کے آس پاس کی دلّی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی اور اسکی تاریخی صورتِ حال کو پوری تخلیقی سچّائیوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور واقعات کی جزیات نگاری میں بیحد کامیاب رہے ہیں۔ ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' میں مصنف نے حیدر خان، پنڈت، دینا ناتھ، سبحان میاں، تارا، چنبیلی جیسے کرداروں کی مدد سے ناول کی شروعات کی ہے اور یہی وہ کردار ہیں جو ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھنے کا حوصلہ کرتے ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ تاریخی اعتبار سے اس میں کتنا سچ ہے مگر ناول کا مطالعہ کریں تو ان جیالوں کی بے لوث جدّ و جہد اور حب الوطنی کے جذبے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ناول کا پلاٹ بے حد وسیع اور گمبھیر ہے مگر اسکا اندازہ ناول کے آغاز سے لگانا مشکل ہے۔ ناول کی شروعات بے حد سادہ اور غیر اہم ہے مگر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے ناول کا بیانیہ اور اسکا اسلوب بھی گمبھیر ہوتا جاتا ہے۔ ناول کی شروعات کچھ اس طرح ہوتی ہے۔ ایک غیر سنسان اور ویران قبرستان میں رات میں کچھ لوگ جمع ہیں اور آگ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ اچانک خاموشی ٹوٹتی ہے۔

اف کتنی شدید ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔ تارا بائی نے جلتی لکڑیوں کو آگے بڑھایا اور زور سے پھونک ماری چنگاریاں جگنوؤں کی طرح اڑنے لگیں۔ حیدر خان نے دھوئیں کو ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے کہر میں ڈوبے ہوئے قبرستان پر نظریں ڈالیں، جھاڑیاں اندھیرے میں عجیب شکلیں بنا رہی تھیں۔ ویسے یہ جگہ کافی محفوظ ہے۔ ''ہم نے اسے یوں ہی تو نہیں پسند کیا ہے حیدر بھائی'' پنڈت نے آگ کے شعلوں پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا، ''ہمیں یہاں سے کوئی گرفتار نہیں کرسکتا''

اس طرح کے سادہ جملوں سے ناول کا آغاز ہوتا ہے جس سے بظاہر اندازہ نہیں ہوتا کہ آگے چل کر ناول بے حد سنجیدہ اور اہم ہو جائیگا۔ دو چار جملوں کے بعد ہی نورالحسنین اپنے کرداروں کو تراشنے کا عمل شروع کر دیتے ہیں اور ناول کو سنجیدگی کے مدار میں داخل کرنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ اب یہی کردار جو قبرستان میں آگ کے ارد گرد جمع ہیں اس طرح کے مکالمے ادا کرنے لگتے ہیں۔

''ملک کے حالات عجیب ہو گئے ہیں کیا کہتے ہو اس سلسلے میں حیدر بھائی؟'' پنڈت نے اپنی کمبل کے سرے کو پیٹھ پر ڈالتے ہوئے سوال کیا، حیدر خان نے اپنی مٹھیوں کو تیز تیز کھول بند کیا اور پھر دونوں ہاتھوں کو سختی سے جوڑتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کہنا شروع کیا، ''سارے ہندوستان میں اک عام سی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔''

ان جملوں کی گمبھیرتا سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہیں سے حیدر خان کے کردار کو تشکیل دینے اور تراشنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہاں حیدر خان ایک ایسے کردار یا شخص کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے یا تو ان حالات کا علم ہے جن سے اسکے دیگر ساتھی ناواقف ہیں یا پھر اسکے ذہن میں کچھ منصوبے یا اسکی آنکھوں میں کچھ خواب ہیں جنہیں وہ ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہاں میں اپنے اس مشاہدے کو بھی شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ مصنف نے اس ناول میں ایک ایسا استعاراتی نظام بھی قائم کیا ہے جو کہانی کے ساتھ ساتھ زیریں لہر کے طور پر رواں ہے اور کہانی کی تعبیر اور تفہیم میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کرداروں کا آگ کے ارد گرد جمع ہونا، آگ تاپنا اور آگ کے شعلوں پر شعوری یا غیر شعوری طور پر ہاتھ رکھنا بھی بے حد معنی خیز اور استعاراتی ہے۔ دراصل یہ آگ ایک استعارہ ہے ذہنوں میں سلگتی آزادی کی آگ کا، انگریزوں کے خلاف ذہنوں میں پلتی ہوئی نفرت کی آگ کا۔

www.urduchannel.in

ناول کے آغاز میں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ چند کردار جن کے دلوں میں اگر چہ فرنگیوں کے ظلم وستم کے خلاف غم وغصّہ ہے ہندوستان کی آزادی کی جدّ وجہد میں عملی طور پر نمایاں کردار ادا کریں گے۔اور حصولِ آزادی کے راستے میں پہلا پرچم لہرائیں گے۔حیدر خان اور چنبیلی ناول کے مرکزی کردار ہیں اس کے علاوہ سجان میاں، دینا ناتھ، پنڈت اور تارا بھی کہانی کے تانے بانے کا اہم حصّہ ہیں لہٰذا کہانی کو آگے بڑھانے کی ذمے داری بھی انہی کرداروں کے کاندھوں پر ہے اور یہی وہ کردار ہیں جن کا بتدریج ارتقاء بھی ہوتا ہے۔حیدر خان بے حد رحم دل، حق پسند اور بہادر ہے اور اسکے دل میں عورتوں کے لئے عزّت و احترام کا جذبہ بدرجہء اتم موجود ہے اس سے بڑھ کر اس کے دل میں اپنے ملک سے بھی بے پناہ محبت ہے۔چنبیلی جو لکھنؤ کی مشہور طوائف عزیزن بائی کے گلشن کا خوبصورت پھول تھی ایک دن گورے اسے پستول کی نوک پر اغوا کرز بردستی چھاؤنی میں لا کر اس کی عصمت دری کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر حیدر خان سارجنٹ بف اور اسکے دیگر بدکار ساتھیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے چنبیلی کو لے کر گوداوری میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور اس طرح اس کی عزّت تار تار ہونے سے بچ جاتی ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ چنبیلی عزیزن بائی کے کوٹھے کی رونق ہے حیدر خان اسے اپنی شریکِ حیات کا درجہ دے کر اسے عزت اور وقار دیتا ہے۔تارا جو کہانی کا اہم کردار ہے اسے بھی حیدر خان ظالموں اور ہوس پرستوں کے نرغے سے رہائی دلا کر منھ بولی بہن کا درجہ دیتا ہے اس طرح وہ ان دونوں عورتوں کی نگاہ میں وہ ایک فرشتہ صفت انسان کے روپ میں استھاپت ہو جاتا ہے اور اسطرح اس کے کردار کا ارتقاء ایک انصاف پسند، فراخ دل اور بہادر انسان کے روپ میں ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر چہ ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' کی کہانی گمبھیر ہے مگر نور الحسنین کی تخلیقی ہنرمندی کا کمال یہ ہے کہ وہ ناول کی فضا کو کسی بھی مقام پر بوجھل نہیں ہونے

دیتے۔ناول میں جہاں ایک طرف چنبیلی اور تارا کی دکھ بھری داستان ہے، فرنگیوں کا ظلم وستم ہے، جدّ وجہد آزادی کے مشکل ترین منصوبے اور ادھورے خواب ہیں، قتل وغارت گری، زخم، آنسو اور آہیں اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی، مایوسی اور بے چارگی ہے شاہی محل میں ہونے والی سازشوں کے قصّے ہیں وہیں سلیم اور نیلوفر کے درمیان محبت کا خوبصورت اور دلکش احساس اور چنچل رومان کی دل آویز صداقتیں ہیں، حضرت امیر خسروؒ اور نظام الدین اولیاء اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے روضوں کی روحانی فیوض و برکات اور ان کی معطر فضائیں ہیں، جمنا کا خوبصورت ساحل ہے، اختر علی بیگ کے یہاں منعقد ہونے والی ادبی محفلیں اور مشاعرے ہیں، دینا ناتھ اور تارا کی شادی کی تقریبات ہیں، شاہی محل میں عیش و عشرت کی کہانیاں ہیں، اس سے بڑھ کر قدیم دلّی کے چاندنی چوک بازار کی رونق اور چہل پہل ہے جو ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے۔یہاں قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ نور الحسنین نے اس بازار کی رونقوں کو نہایت خوبصورتی سے پورٹریٹ کیا ہے اور جو زبان استعمال کی ہے اس سے زبان پر ان کی گرفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر ناول سے ہی ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''دن کیا نکلتا تھا گویا عید کا چاند دیکھ کر ہی نکلتا تھا۔چاندنی چوک کی سڑک فردوسِ بریں کا روپ دھارن کر لیتی۔حسنِ لازوال کی پریاں ماہتابوں کی صورت سیاہ نقابوں میں سے جھانکتی ہوئیں اس طرح اٹھلاتیں گویا آسمان سے کہکشاں زمین پر اتر آئی ہے۔جسے دیکھو چندے ماہتاب و آفتاب۔گویا دلّی کا چاندنی چوک نہیں کوہِ قاف کا کوئی بازار ہے اور پریاں اٹھلاتی پھر رہی ہیں۔سرو قد، پستہ قد، چھریرے بدن، آہو چشم، سر سے پاؤں تک سونے چاندی میں لدی ہوئیں، رنگ برنگے ڈوپٹے لہرا رہے ہیں، کامدانی کاموں سے مزیّن سرخ، نیلے، پیلے، سبز، بنفشی، اطلسی گھیر دار لہنگے، زمین پر خوبصورت جوتیاں چیخ رہی ہیں۔حنائی انگلیاں اشیائے ضروریہ کی طرف اشارے کر

www.urduchannel.in

رہی ہیں اور انگلیوں کے پور پور میں ہیرے کی انگوٹھیاں ان کے جاہ و حشمت کی داستانیں بیان کر رہی ہیں۔

اور ادھر جمنا کے کنارے کچھ اور ہی منظر ہے۔ حسینائیں پانی میں کھیل رہی ہیں۔ گویا دریا میں کنول کھل رہے ہیں اور موجیں محبوب کی مانند اٹھلاتی بل کھاتی ناز و انداز دکھلا رہی ہیں۔ شفّاف پانی میں غوطہ زنی ہو رہی ہے گویا آسمان سے سارے ہی ستارے زمین پر اتر آئے ہیں۔ ان میں کچھ شوخ ہیں، کچھ الھڑ ہیں، کچھ بے پرواہ ہیں، کچھ شرمیلی ہیں، سمٹی سمٹائی ہیں، تقدّس آنکھوں کو اٹھنے نہ دے تو عقیدت بے نیاز کر رہی ہے۔"

محولہ بالا اقتباس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ نورالحسنین کے یہاں زبردست تخلیقی قوّت ہے، کہانی کہنے کا انکا اپنا انداز ہے، جزیات نگاری پر انہیں قدرت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا اہم اور قابلِ ذکر ناول تخلیق کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اپنے اس ناول کے سببِ تخلیق کے بارے میں وہ خود بتاتے ہیں کہ "اس ناول کو لکھنے کی جسارت کے پیچھے ایک وجہ یہ بھی رہی کہ میرے ہم عصروں نے تاریخی موضوعات پر کوئی ناول نہیں لکھا تھا البتّہ دیگر سماجی ، سیاسی معاشرتی موضوعات پر انہوں نے نہایت اچھے ناول لکھے ہیں جن کی ادب کے میزانوں پر خوب پزیرائی بھی ہوئی...... میں نے پوری کوشش کی کہ تاریخی واقعات ، کردار اور ماحول کی صحیح عکاسی کر سکوں اسکے لئے جس قدر میں مطالعہ کر سکتا تھا میں نے کیا اور تاریخی واقعات کی صحت کا خیال رکھا۔"

نورالحسنین کی اس رائے کی روشنی میں یہ بات تو طے ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے نسبتاً ایک مشکل راستہ چنا۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ انہوں نے تاریخی واقعات کی صحت کا حتی الامکان خیال رکھا ہے مگر میرے نزدیک اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے ان تاریخی واقعات کو رقم کرتے ہوئے فکشن کے اصول و

ضوابط کا کتنا خیال رکھا ہے؟۔ میرے لئے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ مصنف اس محاذ پر بھی پوری طرح کامیاب رہا ہے۔

اگر چہ ۱۸۵۷ء کی جدّ و جہد آزادی کے راستے میں بے شمار حادثات و واقعات رونما ہوئے ہیں مگر نورالحسنین نے جن تاریخی واقعات کا ذکر خصوصی طور پر ذکر کیا ہے ان میں منگل پانڈے کی شہادت کا واقعہ بھی ہے اسکے علاوہ میرٹھ، کانپور، فیض آباد، لکھنؤ، جھانسی، دلّی، کالپی، فتح پور اور الہ آباد کی مسلّح مزاحمتوں کا ذکر بھی ناول کی تاریخی حیثیت کو وقار عطا کرتا ہے۔ عام آدمی کے دلوں میں حصولِ آزادی کے جذبوں کو مزید روشن اور تابناک بنانے کے لئے انہوں نے کئی ٹریٹمنٹ کئے ہیں مثال کے طور پر سلیم اور نیلوفر کے درمیان پنپتی محبت میں انہوں نے ایک زاویہ یہ بھی نکالا کہ سلیم جب نیلوفر سے پوچھتا ہے کہ وہ اسے کس روپ میں دیکھنا چاہتی ہے تو بغیر کسی توقف کے نیلوفر کی زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے کہ وہ سلیم کو ایک سپاہی کے روپ میں دیکھنا پسند کرے گی۔ اس جملے کا اثر سلیم کے ذہن و دل پر اتنا گہرا پڑتا ہے اور وہ آزادی کی جدّ و جہد میں شامل ہو جاتا ہے اور آخر کار جامِ شہادت نوش کر کے سرخ رو ہو جاتا ہے۔ اس واقعے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی مزاحمت میں بھلے ہی کامیابی نہ ملی ہو مگر بڑے پیمانے پر عوامی مزاحمت اور قربانیوں کے سبب انگریزوں کے حوصلے پست ضرور ہو جاتے ہیں۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں کہانی کا تسلسل کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ چونکہ انگریزوں کے خلاف غم و غصّے کی لہر بیک وقت دلّی کے علاوہ کئی شہروں میں محسوس کی جاتی ہے لہٰذا الگ الگ مقامات پر فرنگیوں کے خلاف مزاحمت میں شریک جیالوں کے درمیان مواصلات کا نظام بھی زبردست ہونا چاہئے اور ناول میں اس کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے۔ ناول کے تمام اہم کردار ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے نہ صرف باخبر رہتے ہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کے اندیشوں اور امکانات کی خبریں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے رہتے ہیں۔ مبارک

www.urduchannel.in

پور چھاؤنی میں انگریزوں کے خلاف چل رہی بغاوت کی خبر حیدر خان تک پہنچانے والا شخص طالب احمد ہے۔ طالب احمد نے بتایا کہ کمپنی سرکار نے ایک نئے کارتوس کا انتظام کیا ہے جس کے سرے پر سور اور گائے کی چربی لگی ہے اور اس کارتوس کو استعمال سے پہلے دانت سے توڑنا ہوتا ہے۔ جس کے خلاف ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے دلوں میں شدید غم وغصّہ کی لہر پائی جاتی ہے۔ یہ سن کر پنڈت جذباتی ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تو ہمارا دھرم نشٹ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور پھر کئی ہندوستانی سپاہی ان نئے کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں جنرل ہیری کے عتاب اور غصے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح بہرام پور کی خبروں کی ترسیل بھانو کے ذمے ہے بھانو پرتاپ یہ خبر لاتا ہے کہ بہرام پور سے دلّی، مراد آباد، کالپی، جھانسی، بدایوں، کانپور، بنارس، فتح پور، نوگانگ، گوالیار، لکھنؤ، آرہ اور دیگر کئی مقامات تک فرنگیوں کے خلاف نفرت کی چنگاریاں پھیل چکی ہیں۔ بھانو بہرام پور کے ۲۴ مارچ کے واقعے کی تفصیل بھی بتاتا ہے جس کے مطابق سارجنٹ ہکسن ان نئے کارتوسوں کے استعمال کا طریقہ سکھانے والا تھا مگر منگل پانڈے نے سپاہیوں کے سامنے ایک جوشیلی تقریر کر کے ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں اسے آخر کار جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

میرٹھ کے واقعات کا جائزہ لینے کے لئے دینا ناتھ اور تارا خود جاتے ہیں جہاں فرنگیوں کے خلاف سب سے بڑی بغاوت انجام پاتی ہے اور بہت خون خرابہ ہوتا ہے مگر مجاہدینِ آزادی کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں، اور یہیں یہ فیصلہ بھی ہوتا ہے کہ اب دلّی کی طرف کوچ کرنا چاہئے اور اسے انگریزوں کے قبضے سے آزاد کر کے اقتدار خاندانِ مغلیہ کو سونپ دینا چاہئے۔ لہٰذا مجاہدین کا لشکر دلّی کی طرف کوچ کرتا ہے۔ مجاہدین کی ایک بڑی تعداد دلّی میں مزاحمتی کوششوں کا آغاز کرتے ہیں۔ مصنف نے دلّی کی جدّ وجہد آزادی کا بھی ذکر بڑی تفصیل سے

کیا ہے جہاں بہادر شاہ ظفر کی مجبور اور ناکام حکومت انگریزوں کی دستِ نگر ہے اور قلعہ کے باہر ہونے والی سرگرمیوں سے بے خبر بھی اور یہی سبب ہے کہ بادشاہ سلامت اپنے شہزادے سے کچھ یوں مخاطب ہیں۔

”جانِ پدر ہواؤں کے شور سے برسات نہیں ہوتی۔ وقتی جذبات معرکے سر نہیں کرتے۔ سراب دھوکہ دیتے ہیں، ہماری نظروں میں تو صحرا ہی صحرا پھیلا ہے۔“ مگر شہزادہ مرزا مغل پر امید ہے اور ظلِ الٰہی سے اس طرح گویا ہے ”لیکن حضور انقلاب کی یہ آندھی نہ تو وقتی فیصلہ ہے اور نہ ہی صرف ہواؤں کا شور، حضور ظلِ الٰہی یہ ایک تند و تیز سیلاب ہے اور جو بھی اسکی زد میں آئے گا وہ خش وخاشاک کی طرح بہہ جائیگا۔“

چونکہ شہزادہ مغل نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے اور وہ آزادی کی نئی صبح کا خواب دیکھ رہا ہے لہٰذا مجاہدینِ آزادی کی مزاحمتوں سے پر امید بھی ہے۔ مگر بادشاہ بہادر شاہ ظفر خاصے مایوس ہیں۔ کانپور، لکھنؤ، اناؤ، شاہجہاں پور، مرادا باد اور دیگر مقامات پر ہونے والی مزاحمتوں کا ذکر بھی نورالحسنین نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس جدوجہد میں ہندو مسلم دونوں طبقات کی مشترکہ کوششوں کو بھی نہایت اہتمام سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات اور کہ ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی میں کامیابی نہ ملی ہو مگر یہ سچ ہے کہ ۱۹۴۷ میں حاصل ہونے والی آزادی کی بنیاد دراصل ۱۸۵۷ میں ہی پڑ چکی تھی۔

نورالحسنین کا یہ ناول ”ایوانوں کے خوابیدہ چراغ“ بلا شبہ موجودہ عہد میں ناول نگاری کے باب میں ایک خوبصورت موڑ ہے۔ اور مصنف کی تخلیقی ہنرمندی کا کمال بھی۔ مجھے امید ہے کہ انکا آئندہ ناول بھی ناقدینِ ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں کامیاب رہے گا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

کوئی صورت تو خرابے میں نمو کی نکلے

گزشتہ کئی دہائیوں میں اردو شاعری نے اپنا چہرہ کئی بار بدلا ہے،روایتی شاعری سے انحراف کے نتیجے میں ترقی پسند شاعری اپنے موضوعات اور عام آدمی کے مسائل کے اظہار کے سبب عوام میں مقبول ہوئی مگر اشتراکی فکر اور فلسفے کے زیر اثر پروان چڑھتی ترقی پسند شاعری نے ۱۹۸۰ءتک آتے آتے اپنے موضوعات کی یکسانیت اور براہِ راست اظہار کی وجہ سے نہ صرف اپنی ساری چمک کھودی بلکہ اس نے ایک نئے شعری رجحان کے لئے راستہ بھی ہموار کیا جسے ہمارے ناقدینِ ادب نے جدید شاعری سے موسوم کیا جس نے بعد میں باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی اور یہ طے پایا کہ نئے موضوعات اور نئے علامتی اسلوب کے تحت اپنا تخلیقی سفر کرنے والے شعراء ہی اس تحریک کا حصّہ ہوں گے۔مگر یہ منشور بھی مشروط ہی ٹھہرا کہ جدید شعراء نے اپنے تمام تر تخلیقی اظہارات کو اپنی ذات تک محدود کر دیا اور بے یقینی،تنہائی،یاس،قنوطیت اور

انسان کی بے چہرگی ہی جدید شاعری کے غالب موضوعات قرار پائے،یہ جدت یہیں نہیں رکی بلکہ بعض شاعروں نے تو اپنی ذاتی علامتیں بھی وضع کر لیں جسکا ایک نقصان تو یہ ہوا کہ جدید شاعری کا بہت سارا سرمایہ عدم ترسیل کا شکار ہو گیا جس نے قاری کو علامتی شاعری سے بہت دور کر دیا پھر ۱۹۸۰ء کے آس پاس شاعری کا ایک نیا چہرہ نمودار ہوا جس کے مطابق غیر مشروط ذہنی رویوں کے ساتھ آزاد فضا میں شاعری کی صورتِ حال کو مابعد جدید شاعری کا نام دیا گیا۔مابعد جدید شاعری کے بنیاد گزاروں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا نام سرِ فہرست ہے اس کے علاوہ اس نئے رجحان کی ترویج واشاعت میں جن ناقدینِ شعر وادب کا نام نمایاں طور پر لیا جا سکتا ہے ان میں ڈاکٹر وہاب اشرفی اور نظام صدیقی وغیرہ اہم ہیں،

مابعد جدید ادبی نسل کی ایک نئی کھیپ سامنے ہے،جس کے پاس تین دہائیوں سے زائد عرصہ پر مشتمل شعری سرمایہ ہے اور یہ نسل اپنی شناخت کے تعین کے مراحل میں ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نسل میں ایک قابلِ لحاظ تعداد جینوئن شعراء کی ہے،جن میں ایک نمایاں نام سنجے مشر اشوق کا بھی ہے،جو رہتے تو لکھنؤ میں ہیں مگر ان کے دل میں پورا ہندوستان دھڑکتا ہے،وہ اپنی مٹّی،اپنی تہذیب وثقافت اور اپنے شہر کو اپنی شاعری میں جینا چاہتے ہیں،وہ غزل اور نظم ہر دو اصناف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اس کے علاوہ رباعیات سے بھی انہیں عشق ہے اور وہ رباعی محض منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے نہیں کہتے بلکہ رباعیات کو وہ باقاعدہ اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں لکھنؤ میں ان سے ایک طویل ملاقات کا موقع میسر آیا تو دورانِ گفتگو یہ اندازہ لگانے میں مجھے دشواری نہیں ہوئی کہ وہ نظم وغزل کی فنی باریکیوں سے تو کماحقہ واقف ہیں۔اس کے علاوہ رباعیات کے تخلیقی رمز سے بھی گہرا علاقہ رکھتے ہیں،مجھے وہ پہلی نظر میں ہی سادگی پسند اور بے حد شانت نظر آئے،ان کی گفتگو میں ایک ٹھہراؤ اور سنجیدگی ہے جو انکے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں،مجھے

www.urduchannel.in

انداز ہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ نام ونمود اور شہرت سے دور بھاگنے والے اور خود سے بے نیاز رہنے والے سنجے مشرا شوق اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں اوران کے دکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہتے ہیں میرے خیال میں یہی خوبیاں انہیں ایک اچھا،سچا اور ایماندار شاعر بناتی ہیں۔

سنجے مشرا شوق کی شاعری پر با قاعدہ گفتگو کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ انکی تخلیقات ہندو پاک کے اہم ادبی رسائل میں نہایت اہتمام سے شائع ہوتی ہیں اور ناقدین شعر و ادب سے داد و تحسین وصول کرتی ہیں ،ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے، جوان کی شاعری کو کتابی شکل میں دیکھنے کا متمنی ہے امید ہے انکی یہ خواہش جلد پوری ہوگی۔

یوں تو سنجے مشرا شوق کی شاعری رسائل و جرائد کے حوالے سے مجھ تک پہنچتی رہی ہیں مگر ان کی غزلوں کے تفصیلی مطالعے سے یہ منکشف ہوا کہ ان کے یہاں شاعری محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ ذات و کائنات کے مطالعے اور مشاہدے کی روشنی میں زندگی کو سمجھنے کی ایک ایماندارانہ کوشش ہے اور کافی حد تک وہ اس میں نہ صرف کامیاب ہوئے ہیں، بلکہ اپنا ایک الگ لہجہ بھی تلاش کر لیا ہے جس کے سبب انکی شاعری دور سے پہچان لی جاتی ہے۔

کوئی آساں نہیں اردو غزل میں گفتگو کرنا
لہو تھوکا ہے میں نے رات دن لہجہ بنانے میں

سنجے مشرا شوق کو احساس ہے کہ شاعری میں اپنا لہجہ دریافت کرنا کتنا مشکل ہے وہ بھی لکھنؤ جیسے شہر میں جس نے بے شمار مایہ ناز اساتذۂ سخن اور اہلِ زبان پیدا کئے، انہیں اندازہ ہے کہ لکھنؤ نہ صرف گہوارہء ادب رہا ہے بلکہ اپنی تہذیب وتمدن کے لئے دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے،اور شاید اسی لئے انہوں نے کہا ہے کہ

لکھنؤ ناز ہے جس پر وہی کہنہ تہذیب
ہم نے ورثے میں سلیقے سے سنبھالی ہوئی ہے

نہ صرف اپنے اجداد کی تہذیبی وراثت بلکہ وضع داری اور شرافت سے بھی وہ مالا مال ہیں۔

وضع داری مجھی سے ہے قائم
یہ وبا میرے خاندان میں ہے

سنجے مشرا شوق کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں زندگی کی تفہیم کا ایک الگ نظریہ ہے،ان کی اندر کا انسان ایک بے حد مخلص، دردمند، فقیر اور قلندرانہ مزاج کا حامل ہے،اوران کی شخصیت کا یہ روپ جگہ جگہ ان کی شاعری میں بھی منعکس ہوتا نظر آتا ہے،ان کے اندر کا حساس انسان بار بار اس اندیشے سے دو چار ہوتا ہے کہ وہ مکر وفریب اور بغض وحسد سے بھری اور جذبات سے عاری اس دنیا کے آدمی نہیں ہیں اور شاید اسی احساس نے ان کے یہاں اس شعر کی تخلیق کا جواز پیدا کیا ہے،

ایک مدّت سے یہی تو سوچتا ہوں رات دن
میں کہاں کا آدمی تھا ، اور کہاں پیدا ہوا

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ سنجے مشرا شوق ایک دردمند اور حساس انسان ہیں،لہٰذا انکے یہاں شاعری میں ایسے موضوعات از خود اپنا جواز تلاش کر لیتے ہیں جو معاشرے میں عام انسان کے مسائل و مصائب،زندگی کی جد و جہد اور تہذیبی،فکری اور معاشرتی شکست وریخت سے عبارت ہوں،انہیں اندازہ ہے کہ ایک انسان کی آسودگی اور خوش حال زندگی سے حسد کرنے والے معاشرے میں توازن برقرار رکھنا کتنا مشکل ہے۔

www.urduchannel.in

بلند قامتی چبھنے لگی تھی دنیا کو
سو میرے کاندھے سے گردن اتار دی گئی ہے

سرفرازی میں کبھی نوکِ سناں پر تھے ہم
انکساری میں بھی اب تیغِ گلو رکھی گئی

نہ جانے لوگ اس دنیا میں کیسے گھر بناتے ہیں
ہماری زندگی تو کٹ گئی نقشہ بنانے میں

سنجے مشرا شوقؔ ایک خاموش طبیعت انسان ہیں ہمیشہ کچھ سوچتے ہوئے، اپنا محاسبہ کرتے ہوئے اپنے دل کے ہجرے میں بیٹھ کر مراقبہ کرتے ہوئے اپنی تلاش میں ذات کے سفر پہ نکلے ہوئے دور تک، خود سے مکالمہ کرتے ہوئے اور اپنے وجود کی گہرائیوں سے ایک ایسے انسان کی دریافت کرنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں جو دنیا سے بے نیاز ہے۔

نہ جانے کب سے وہ بیٹھا ہے دل کے ہجرے میں
صدی گذر گئی ، پورا نہ اعتکاف ہوا

مرے مریدوں میں بھی جنگ ہے خلافت کی
میں خانقاہ سے باہر ہوں پیر ہوتے ہوئے

بادشاہت مجھے آواز تو دیتی ہے مگر
میری چوکھٹ کے گداگر نہیں اٹھنے دیتے

تھکی تھکائی ہوئی جسم کی قبا کو چھوڑ
ہے تازگی کی تمنا کفن سے باہر چل

سنجے مشرا شوقؔ کی شاعری کا کینوس وسیع ہے ان کی فکری جہات کئی دشاؤں میں منعکس ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک طرح کی رنگا رنگی اور تنوع ہے جس سے ان کی قابلِ لحاظ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی شاعری میں علامت نگاری تو ہے مگر ایسی نہیں کہ اشعار ترسیل کے المیہ کا شکار ہو جائیں، غزل ان کی محبوب صنفِ سخن ہے مگر انہیں رباعی کہنے میں بھی خاصی مہارت حاصل ہے، رباعی ایک مشکل صنف ادب ہے اور اب اسے کامیابی سے لکھنے والے خال خال ہی رہ گئے ہیں ایسے میں رباعی لکھنا اور وہ بھی ایک ایسے شاعر کا جو اہلِ زبان نہیں، نیک فال ہی کہا جائے گا۔

سنجے مشرا شوقؔ کی رباعیات میں نے دلچسپی سے پڑھی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انکے یہاں رباعی کے موضوعات میں بھی تنوع ہے اور عصری فکر اور جدید تخلیقی تقاضوں سے مزین ہیں انکی رباعیات جس کے بارے میں بقول ان کے

رباعی سب کے قابو میں کہاں آتی ہے اے سنجے
وگرنہ شہر میں ہر آدمی خیام ہو جائے

چند رباعیات ملاحظہ فرمائیں

موسم کے تغیر سے مچلتی ہے زمین
پھولوں کی طرح رنگ بدلتی ہے زمین

www.urduchannel.in

منزل کو سمٹنا ہے مری ہی جانب
رکھتے ہیں مرے پاؤں تو چلتی ہے زمین

نغموں کی طرح ساز میں کھو جاتے ہیں
سب اپنی ہی آواز میں کھو جاتے ہیں
گیانی ہوں کہ دھیانی ہوں زمیں پہ آکر
اس انجمنِ ناز میں کھو جاتے ہیں

رخ اپنا کسی سمت نہیں موڑتی ہے
جو کچھ بھی بناتا ہوں اسے توڑتی ہے
امید تو دیتی ہے دلاسے لیکن
پیچھا مرا تقدیر کہاں چھوڑتی ہے

خاموش فضا بول رہی ہے مجھ سے
لگتا ہے ہوا بول رہی ہے مجھ سے
اپنے کو بہکنے سے بچا لو اے شوقؔ
میری ہی دعا بول رہی ہے مجھ سے

نادان ہی اچھا ہے نہ دانا اچھا
بیگانہ ہی اچھا نہ یگانہ اچھا
یہ بات بزرگوں سے سنی ہے ہم نے
اچھے ہو اگر تم تو زمانہ اچھا

محولہ بالا رباعیات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنجے مشرا شوق رباعی کے تخلیق رموز اور فنی باریکیوں سے واقف ہیں اور ہمارے عہد کے ان شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے یہاں شاعری زندگی سے عبارت ہے۔ان کی غزلیں ہوں کہ رباعیات، عصری فکر سے مملو اور تخلیقی ہنرمندی سے بھرپور، مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ سنجے مشرا شوق ۱۹۸۰ء کے بعد اپنی شناخت حاصل کرنے اور ایوانِ ادب میں اپنی موجودگی درج کرانے والے شعراء کے قافلے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کا تخلیقی سفر جاری ہے اور وہ تازہ دم بھی ہیں، لہٰذا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی شاعری کو مزید نئے اور انوکھے ذائقے سے روشناس کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in